
جہانِ معلوم
افتخار عارف



مہر دو نیم سے افتخار عارف کی فوری شہرت کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ معلوم ہونے لگا تھا یہی وہ شاعری ہے جو اس وقت خاص و عام طلب کر رہے ہیں اور ادب کے بازار میں اسی کی مانگ ہے۔ اسی وجہ سے یہ اندیشہ بھی ہونے لگا تھا کہ کہیں یہ اسی قسم کی شاعری تو نہیں ہے جس کا لب ولہجہ اچانک منظر پر چھا جاتا ہے اور جو اپنے نئے پن کی وجہ سے سب کو اچھی معلوم ہونے لگتی ہے، پھر وقت گزرنے کے ساتھ غیر دلچسپ اور معمولی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ اسی انداز میں بہت سے لوگ کہنے لگتے ہیں لیکن افتخار عارف کی شاعری کا یہ انداز نہیں کیوں کہ اگرچہ اس شاعری کی نقل بہت کی گئی لیکن ''نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب'' اس میں ایک تو تراکیب سے حسن اور معنویت پیدا ہوئی ہے اور ظاہر ہے تراکیب بازار کی عام پسند کا مال نہیں ہوتیں۔ ''فغان قافلۂ بے نوا'' قسم کی ترکیبوں کو سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے اعلیٰ قسم کے ادبی ذوق کی ضرورت ہے، لیکن بہرحال ان کی ندرت کی وجہ وہ لوگ بھی ان سے لطف لیتے ہیں جن کا ذوق اتنا اعلیٰ نہیں ہوتا۔

عارف کی شاعری کی کامیابی کا دوسرا اور قوی تر سبب اس کے موضوعات اور اس کا لب ولہجہ ہے۔ ان موضوعات کو افتخار عارف ہلکے رمزیہ اشاروں اور لطیف کنایوں میں اسی طرح برتتے ہیں کہ بعض سامنے کے موضوعات میں بھی حسن اور تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور سننے والے ''ہل من مزید'' کہنے لگتے ہیں۔ مجھے بھی ''ہل من مزید'' کہنے والوں میں شمار کیجیے۔

نیّر مسعود

عصر جدید کے شاعروں میں جو نام بہت ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں افتخار عارف کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی شاعری عصری ہونے کے ساتھ کلاسیکی روایت سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ اس عہد کے بعض لکھنے والوں کو پڑھ کر ان پر فارسی اور عربی شاعر کا دھوکہ ہوتا ہے مگر افتخار عارف کو پڑھ کر افتخار ہی ذہن میں آتے ہیں کوئی دوسرا شاعر نہیں۔ انھیں اردو شاعری کا خوش آیند مستقبل کہا جا سکتا ہے۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جہانِ معلوم

جہانِ معلوم

افتخار عارف

پورب اکادمی، اسلام آباد

طبع اول: (پورب اکادمی ایڈیشن) اکتوبر ۲۰۱۳ء
سرِ ورق: حنیف رامے
پس ورق: اقبال مہدی
خطاطی: قاری احمد رضا (آفاقی رقم)
ناشر: پورب اکادمی، اسلام آباد
فون: 051-2317092
ای میل: poorab_academy@yahoo.com

Jahan-e-Maaloom
by : Iftikhar Arif
published by : Poorab Academy, Islamabad, Pakistan

انتساب

اپنی بیٹی گیتی، اُن کے دولہا کامران اور اُن کے بچوّں
اظہر اور زینب کے لیے

قیمۃ کل امرئ ما یحسنہ

(ہر شخص کی قیمت وہ ہنر ہے جو اس شخص میں ہے)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ

ترتیب





جہانِ معلوم



جہانِ معلوم
7



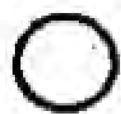
جہانِ معلوم

یاسریع الرضا اغفر لمن لا یملک الا الدعاء

اے جلدی راضی ہو جانے والے (میرے معبود) مجھے بخش دے میرے پاس کوئی پونجی نہیں ہے بجز دعا کے (امام علیؑ)

یہ دنیا اک سوّر کے گوشت کی ہڈی کی صورت
کوڑھیوں کے ہاتھ میں ہے
اور میں نان و نمک کی جستجو میں دربدر قریہ بہ قریہ مارا مارا پھر رہا ہوں
ذرا سی دیر کی جھوٹی فضیلت کے لیے
ٹھوکر پہ ٹھوکر کھا رہا ہوں، ہر قدم پر منزلِ عزو شرف
سے گر رہا ہوں
اور مری انگشتری پر یا علیؑ لکھا ہوا ہے
مگر انگشتری پر یا علیؑ کندہ کرا لینے سے کیا ہوگا کہ دل تو
مرحبوں کی دسترس میں ہے
مسلسل نرغۂ حرص و ہوس میں ہے

(عجب عالم ہے آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل سینوں میں
اندھے ہو چکے ہیں)
اور ایسے میں کوئی حرفِ دعا اِک خواب بنتا ہے
کبھی سلمانؓ آتے ہیں
کبھی بوذرؓ، کبھی میثمؓ، کبھی قنبرؓ مری ڈھارس بندھاتے ہیں
کمیلؒ آتے ہیں کہتے ہیں
پکارو افتخار عارف پکارو
اپنے مولا کو پکارو اپنے مولا کے وسیلے سے پکارو
اُجِیبُ الدَّعْوَةَ الدَّاعِ کا دعویٰ کرتے والے کو پکارو
یہ مشکل بھی کوئی مشکل ہے دل چھوٹا نہیں کرتے
کریم اپنے غلاموں کو کبھی تنہا نہیں کرتے کبھی رسوا نہیں کرتے





فَاذْكُرُوْنِىٓ اَذْكُرْكُمْ

(تو تم یاد رکھو مجھ کو ، میں یاد رکھوں گا تم کو)

(کچھ شعر مکّہ مکرّمہ کے لیے)

منزلِ ذکر میں ہر شہر پہ چھائے ہوئے شہر
کیا ثنا ہو تری قرآن میں آئے ہوئے شہر

میرے آقاؤں کے مسکن ، مرے اللہ کے گھر
میرے نبیوں کی دعاؤں میں بسائے ہوئے شہر

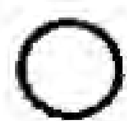
زمزم و کوثر و تسنیم ، تسلسل تیرا
چشمۂ خیر کا فیضان اٹھائے ہوئے شہر



رُخِ سرکارِ دوعالم کے پلٹنے کی تھی دیر
قبلہ رُو ہو گئے سب راہ پہ آئے ہوئے شہر

ایک بوسے کی اجازت حجرِ اسوَد پر
اے مرے نُور کی بارش میں نہائے ہوئے شہر

خاک ہم رتبۂ افلاک ہوئی جن کے سبب
اُن کی آواز سے آواز ملاتے ہوئے شہر





مدحتِ شافعِ محشر پہ مقرر رکھا
میرے مالک نے مرے بخت کو یاور رکھا

میں نے خاکِ درِ حسانؓ کو سُرمہ جانا
اور ایک ایک سبق نعت کا اَزبر رکھا

میں نے قرآن کی تفسیر میں سیرت کو پڑھا
نور کو دائرہ نوُر کے اندر رکھا

نوُرِ مطلق نے اسے خلق کیا خلق سے قبل
منصب کارِ رسالت میں مؤخر رکھا

معنیِ اجرِ رسالت کو سمجھنے کے لیے
زیرِ نگرانیِ سلمانؓ و ابوذرؓ رکھا



خاتمیت کا شرف آپؐ کو بخشا اور پھر
آپ کی دسترسِ خاص میں کوثر رکھا

جس کسی نے بھی کبھی شان میں گستاخی کی
ابد آباد تک اُس شخص کو اَبتر رکھا

تختی لکھی تو اُسی نام سے آغاز کیا
جس کو معبود نے ہر نام سے اُوپر رکھا

منزلِ شکر کہ ہر گام، خوشی ہو کہ الم
وِرد اک اسمِ گرامی کا برابر رکھا

عمر بھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھروں شہر بہ شہر
ایک ہی شہر میں اور ایک ہی دَر پر رکھا

○

مدینے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا
جلال ایسا کہ دل سینے سے نکلا جا رہا تھا

مثالِ فردِ عصیاں تھی کتابِ عمرِ رفتہ
کوئی مجھ میں تھا جو صفحے اُلٹتا جا رہا تھا

بلاوے پر یقیں تھا اور قدم اٹھتے نہیں تھے
عجب سیلِ الم آنکھوں میں اُمڈا آ رہا تھا

ہر اک بولا ہوا جملہ، ہر اک لکھا ہوا لفظ
لہو میں گونجتا تھا اور قیامت ڈھا رہا تھا

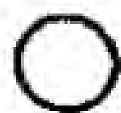


اور ایسے میں اُسی اک نام نے کی دستگیری
وہی جو منتہائے ہر دُعا بنتا رہا تھا

بہت نامطمئن آنکھیں اچانک جاگ اُٹھیں
کوئی جیسے دلِ کم فہم کو سمجھا رہا تھا

مدینہ سامنے تھا، منتظر تھا درِ سخی کا
دلِ آزردہ اپنے بخت پر اِترا رہا تھا

دُعا بعد از دُعا، سجدہ بہ سجدہ ، اشک در اشک
میں مشتِ خاک تھا اور پاک ہوتا جا رہا تھا





نعت

عہدِ میثاقِ ازل، خلق میں دُہراتا کون
میرے سرکارؐ نہ سمجھاتے تو سمجھاتا کون

نسبتِ یُمنِ قدم کر گئی یثرب کو حرم
وہ نہ ہوتے تو مدینے کی طرف جاتا کون

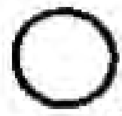
دو کمانوں سے بھی کم منزلِ سدرہ سے اُدھر
ایک عالم ہے اُس عالم کی خبر لاتا کون

اُن کی آواز سے اونچی نہ ہو کوئی آواز!
مالک الملک نہ فرماتے تو فرماتا کون



پاسِ نسبت نے بہت روک کے رکھا ورنہ
فردِ عصیاں کی طرف دیکھ کے شرماتا کون

جن کی خوشنودیِ خاطر سے ہے نعمت مشروط
ان کے دَر چھوڑ کے اوروں کی طرف جاتا کون





مدینہ و نجف و کربلا میں رہتا ہے
دِل ایک وضع کی آب و ہوا میں رہتا ہے

مرے وجُود سے باہر بھی ہے کوئی موجُود
جو میرے ساتھ سلام و ثنا میں رہتا ہے

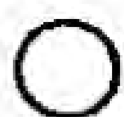
میسّر آتی ہے جس شب قیام کی توفیق
وہ سارا دن مرا ، ذکرِ خُدا میں رہتا ہے

غلام بوذرؓ و سلمانؓ دل خوشی ہو کہ غم
حدودِ زاویۂ ھَلْ اَتیٰ میں رہتا ہے



درُود پہلے بھی پڑھتا ہوں اور بعد میں بھی
اسی لیے تو اثر بھی دُعا میں رہتا ہے

نکل رہی ہے پھر اک بار حاضری کی سبیل
سو کچھ دنوں سے دل اپنی ہَوا میں رہتا ہے





سبیل ہے اور صراط ہے اور روشنی ہے
اِک عبدؐ مولیٰ صفات ہے اور روشنی ہے

کتاب و کردار ساتھ ہے اور روشنی ہے
درُود جُزوِ صلوٰۃ ہے اور روشنی ہے

میانِ معبود و عبد میثاقِ نور کے بعد
نظر میں بس ایک رات ہے اور روشنی ہے

حضورؐ غارِ حرا سے بیت الشرف میں آئے
بس اک یقیں ساتھ ساتھ ہے اور روشنی ہے

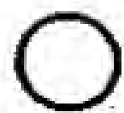


حضورؐ مکے سے جارہے ہیں کتاب کے ساتھ
کتاب کُل کائنات ہے اور روشنی ہے

حضورؐ مکے میں آرہے ہیں کتاب کے ساتھ
کتاب ہی میں نجات ہے اور روشنی ہے

رفیقِ اعلیٰ کا حکم ہے اور کتاب دائم
ابد تک اب انؐ کی ذات ہے اور روشنی ہے

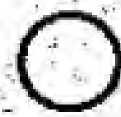
غلامی افتخار عارف پہ مہرِ خاتم
ثبوت فردِ نجات ہے اور روشنی ہے





تعارف

میانِ خالق و مخلوق خطِّ نورِ احمدؐ
محمدؐ خود جسے قرآن فرما دیں وہ قرآن
علیؑ وہ جن کے چہرے پر نظر کرنا عبادت
نبیؐ جن کے لیے تعظیم کو اٹھیں وہ زہراؑ
جوانانِ جناں کے سید و سردار حسنینؑ
شجاعت صبر کے پیکر میں ڈھل جائے تو زینبؑ
وفا امکان سے آگے نکل جائے تو عباسؑ



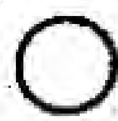


هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ

عجب اک سلسلہ ہے
خدیجہؑ فاطمہؑ زینبؑ
وفا کے باب میں، صدق و صفا کے باب میں، صبر و رضا کے باب میں
کیسا منور راستہ ہے
خدیجہؑ فاطمہؑ زینبؑ
طلوعِ حرفِ اقرا سے صدائے استغاثہ تک
حرا سے کربلا تک
مشیت نے جو اِک خطِ جلی کھینچا ہوا ہے
اُسی کا نور ہے جو دل بہ دل منزل بہ منزل ہر طرف پھیلا ہوا ہے
رسالت کی گواہی ہو، ولایت کی گواہی ہو، امامت کی گواہی ہو



جو یہ کہہ دیں وہی میزانِ حق میں مستند مانا گیا ہے
خدیجہؑ فاطمہؑ زینبؑ
گواہی میں تسلسل اور پھر ایسا تسلسل
آپ خود اپنی جگہ اک معجزہ ہے
خدیجہؑ اور ابوطالبؑ نے جس منزل سے ناموسِ رسالتؐ کی
حفاظت کی یہ سارا معجزہ اس کی جزا ہے
یہ ہم جو آج بھی دنیا میں پہچانے گئے ہیں
لائقِ اکرام گردانے گئے ہیں
انھیں کے در کا صدقہ ہے انھیں کی سب عطا ہے
خدیجہؑ فاطمہؑ زینبؑ
عجب اک سلسلہ ہے
وفا کے باب میں، صدق و صفا کے باب میں،
صبر و رضا کے باب میں کیسا منور
راستہ ہے





بحضور سیّد الشہدا ؑ

میانِ تیغ و سناں ، لَا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ
حدیثِ شعلہ بجاں ، لَا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ

مقامِ سجدۂ بے اختیار ، عجز تمام
کمالِ حرف بیاں ، لَا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ

جہاں رسول ؐ کے نقش قدم وہیں پہ علی ؑ
وہیں حسین ؓ جہاں لا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ

ہر امتحان ، ہر اک ابتلا کی منزل میں
قرار دل زدگاں لا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ

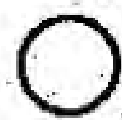


شہود و شاہد و مشہود ایک ہوں کہ نہ ہوں
امین و امن و اماں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

غبار اڑاتے ہوئے وقت کے مقابل بھی
حصارِ نام و نشاں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

سوالِ بیعتِ دربارِ شام اور حسینؓ
کہاں یزید کہاں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

کنارِ آبِ رواں ، ارتباطِ مشک و علم
فغانِ تشنہ لباں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ





بحضور سیّد الشہداؑ

کربلا کی خاک پر کیا آدمی سجدے میں ہے
موت رُسوا ہو چکی ہے زندگی سجدے میں ہے

وُہ جو اِک سجدہ علیؑ کا بچ رہا تھا وقتِ فجر
فاطمہؑ کا لال شاید اب اسی سجدے میں ہے

سنتِ پیغمبرؐ خاتم ہے سجدے کا یہ طول
کل نبیؐ سجدے میں تھے آج اِک ولی سجدے میں ہے

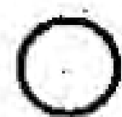
وُہ جو عاشورہ کی شب گُل ہو گیا تھا اِک چراغ
اب قیامت تک اسی کی روشنی سجدے میں ہے



حشر تک جس کی قسم کھاتے رہیں گے اہلِ حق
ایک نفسِ مطمئن اُس دائمی سجدے میں ہے

نوکِ نیزہ پر بھی ہوتی ہے تلاوت بعدِ عصر
مصحفِ ناطق تہِ خنجر ابھی سجدے میں ہے

اِس پہ حیرت کیا لرز اٹھی زمینِ کربلا
راکبِ دوشِ پیمبرؐ آخری سجدے میں ہے





سلام

ذکرِ مظلومؑ کو انعام میں رکھا گیا ہے
ظلم کو زمرۂ دُشنام میں رکھا گیا ہے

از ازل تا بہ ابد سارے یزیدوں کا حساب
ایک ہی دفترِ بدنام میں رکھا گیا ہے

تا قیامت کسی ظالم کو نہ ہو جرأتِ ظلم
صبر کو منزلِ اقدام میں رکھا گیا ہے

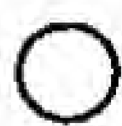
کربلا ہو کہ نجف ہو کہ مدینہ سب کو
نور کے سلسلۂ عام میں رکھا گیا ہے



میں نے تقویمِ شہادت پہ نظر کی تو کھُلا
خاک کو شیشۂ ایام میں رکھا گیا ہے

صبرِ مخدومۂ کونین کی وارث زینبؑ
اِک نشانی کہ جیسے شام میں رکھا گیا ہے

مفتخر ہوں تو یہ فیضانِ کرم ہے ان کا
اُن کی نسبت کو مرے نام میں رکھا گیا ہے



سلام

حسینؑ! تم نہیں رہے تمھارا گھر نہیں رہا
مگر تمھارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا

مدینہ و نجف سے کربلا تک ایک سلسلہ
اِدھر جو آگیا وہ پھر اِدھر اُدھر نہیں رہا

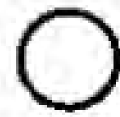
صدائے استغاثۂ حسینؑ کے جواب میں
جو حرف بھی رقم ہُوا وہ بے اثر نہیں رہا

صفیں جمیں تو کربلا میں بات کھل کے آگئی
کوئی بھی حیلۂ نفاق کارگر نہیں رہا



بس ایک نام .... اُنؐ کا نام اور اُنؐ کی نسبتیں
جُز اُن کے پھر کسی کا دھیان عمر بھر نہیں رہا

کوئی بھی ہو کسی طرف کا ہو کسی نسب کا ہو
جو تم سے منحرف ہُوا وہ معتبر نہیں رہا





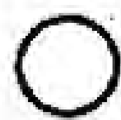
کوچ

جس روز ہمارا کوچ ہوگا
پھولوں کی دکانیں بند ہوں گی
شیریں سخنوں کے حرفِ دشنام
بے مہر زبانیں بند ہوں گی

پلکوں پہ نمی کا ذکر ہی کیا
یادوں کا سراغ تک نہ ہوگا
ہمواریِ ہر نفس سلامت
دل پر کوئی داغ تک نہ ہوگا
پامالیِ خواب کی کہانی
کہنے کو چراغ تک نہ ہوگا

معبود ! اِس آخری سفر میں
تنہائی کو سرخرو ہی رکھنا
جُز تیرے ، نہیں کوئی نگہدار
اُس دن بھی خیال تو ہی رکھنا
جس آنکھ نے عمر بھر رُلایا
اُس آنکھ کو بے وضو ہی رکھنا

جس روز ہمارا کُوچ ہو گا
پھولوں کی دُکانیں بند ہوں گی



ستاروں سے بھرا یہ آسماں کیسا لگے گا
ہمارے بعد تم کو یہ جہاں کیسا لگے گا

تھکے ہارے ہوئے سورج کی بھیگی روشنی میں
ہواؤں سے اُلجھتا بادباں کیسا لگے گا

جمے قدموں کے نیچے سے پھسلتی جائے گی ریت
بکھر جائے گی جب عُمرِ رواں کیسا لگے گا

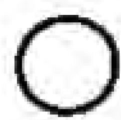
اِسی مٹی میں مِل جائے گی پُونجی عُمر بھر کی
گرے گی جس گھڑی دیوارِ جاں کیسا لگے گا

بہت اترا رہے ہو دل کی بازی جیتنے پر
زیاں بعد از زیاں بعد از زیاں کیسا لگے گا

وہ جس کے بعد ہو گی اک مسلسل بے نیازی
گھڑی بھر کا وہ سب شور و فغاں کیسا لگے گا

ابھی سے کیا بتائیں مرگِ مجنوں کی خبر پر
سلوکِ کوچۂ نا مہرباں کیسا لگے گا

بتاؤ تو سہی اے جانِ جاں کیسا لگے گا
ستاروں سے بھرا یہ آسماں کیسا لگے گا





ہمیں خبر تھی کہ یہ درد اب تھمے گا نہیں
یہ دل کا ساتھ بہت دیر تک رہے گا نہیں

ہمیں خبر تھی کوئی آنکھ نم نہیں ہو گی
ہمارے غم میں کہیں کوئی دل دکھے گا نہیں

ہمیں خبر تھی کہ اک روز یہ بھی ہونا ہے
کہ ہم کلام کریں گے کوئی سنے گا نہیں

ہماری دربدری جانتی تھی برسوں سے
گھر آئیں گے بھی تو کوئی پناہ دے گا نہیں

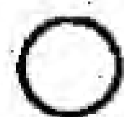


ہماری طرح نہ آئے گا کوئی نرغے میں
ہماری طرح کوئی قافلہ لٹے گا نہیں

نمودِ خواب کی باتیں شکستِ خواب کا ذکر
ہمارے بعد یہ قصے کوئی کہے گا نہیں

غریبِ شہر ہو یا شہریارِ ہفت اقلیم
یہ وقت ہے یہ کسی کے لیے رُکے گا نہیں

مگر چراغِ ہنر کا معاملہ ہے کچھ اور
یہ ایک بار جلا ہے تو اب بجھے گا نہیں





بکھر جائیں گے ہم کیا جب تماشا ختم ہوگا
مرے معبود آخر کب تماشا ختم ہوگا

چراغِ حجرۂ درویش کی بجھتی ہوئی لو
ہوا سے کہہ گئی ہے اب تماشا ختم ہوگا

کہانی میں نئے کردار شامل ہو گئے ہیں
نہیں معلوم اب کس ڈھب تماشا ختم ہوگا

کہانی آپ الجھی ہے کہ الجھائی گئی ہے
یہ عقدہ تب کھلے گا جب تماشا ختم ہوگا

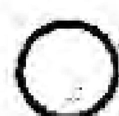


زمیں جب عدل سے بھر جائے گی نورُ علیٰ نور
بنامِ مسلک و مذہب تماشا ختم ہو گا

یہ سب کٹھ پتلیاں رقصاں رہیں گی رات کی رات
سحر سے پہلے پہلے سب تماشا ختم ہو گا

تماشا کرنے والوں کو خبر دی جا چکی ہے
کہ پردہ کب گرے گا کب تماشا ختم ہو گا

دلِ نا مطمئن ایسا بھی کیا مایوس رہنا
جو خلق اٹھی تو سب کرتب تماشا ختم ہو گا





یہ بستیاں ہیں کہ مقتل دُعا کیے جائیں
دُعا کے دن ہیں مسلسل دُعا کیے جائیں

کوئی فغاں، کوئی نالہ، کوئی بُکا، کوئی بَین
کھلے گا بابِ مقفّل دُعا کیے جائیں

یہ اضطراب، یہ لمبا سفر، یہ تنہائی
یہ رات اور یہ جنگل دُعا کیے جائیں

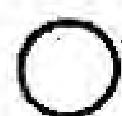
بحال ہو کے رہے گی فضائے خطۂ خیر
یہ حبس ہوگا معطل دُعا کیے جائیں

گذشتگانِ محبت کے خواب کی سوگند
وہ خواب ہو گا مکمل دُعا کیے جائیں

ہوائے سرکش و سفّاک کے مقابل بھی
یہ دل بجھیں گے نہ مشعل دُعا کیے جائیں

غبار اُڑاتی جھلستی ہوئی زمینوں پر
امنڈ کے آئیں گے بادل دُعا کیے جائیں

قبول ہونا مقدّر ہے حرفِ خالص کا
ہر ایک آن ہر اک پل دُعا کیے جائیں



یہ نقش ہم جو سرِ لوحِ جاں بناتے ہیں
کوئی بناتا ہے ہم خود کہاں بناتے ہیں

یہ سُر، یہ تال ، یہ لے، کچھ نہیں بجز توفیق
تو پھر یہ کیا ہے کہ ہم ارمغاں بناتے ہیں

سمندر اُس کا ، ہوا اُس کی، آسماں اُس کا
وہ جس کے اِذن سے ہم کشتیاں بناتے ہیں

زمیں کی دھوپ، زمانے کی دھوپ، ذہن کی دھوپ
ہم ایسی دھوپ میں بھی سائباں بناتے ہیں

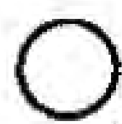


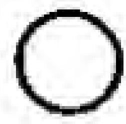
خود اپنی خاک سے کرتے ہیں موجِ نور کشید
پھر اس سے ایک نئی کہکشاں بناتے ہیں

کہانی جب نظر آتی ہے ختم ہوتی ہوئی
وہیں سے ایک نئی داستاں بناتے ہیں

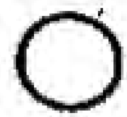
کھلی فضا میں خوش آواز طائروں کے ہجوم
مگر وہ لوگ جو تیر و سناں بناتے ہیں

"پلٹ کے آئے غریب الوطن پلٹنا تھا"
یہ دیکھنا ہے کہ اب گھر کہاں بناتے ہیں





سمندر کے کنارے ایک بستی رو رہی ہے
میں اتنی دور ہوں اور مجھ کو وحشت ہو رہی ہے





دل کو دیوار کریں ، صبر سے وحشت کریں ہم
خاک ہو جائیں جو رُسوائی کو شہرت کریں ہم

اِک قیامت کہ تُلی بیٹھی ہے پامالی پر
یہ گزر لے تو بیانِ قد و قامت کریں ہم

حرفِ تردید سے پڑ سکتے ہیں سو طرح کے پیچ
ایسے سادہ بھی نہیں ہیں کہ وضاحت کریں ہم

دل کے ہمراہ گزارے گئے سب عمر کے دن
شام آئی ہے تو کیا ترکِ محبت کریں ہم

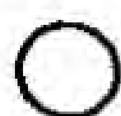


اک ہماری بھی امانت ہے تہِ خاک یہاں
کیسے ممکن ہے کہ اس شہر سے ہجرت کریں ہم

دن نکلنے کو ہے چہروں پہ سجا لیں دُنیا
صبح سے پہلے ہر اک خواب کو رخصت کریں ہم

شوقِ آرائشِ گُل کا یہ صلہ ہے کہ صبا
کہتی پھرتی ہے کہ اب اور نہ زحمت کریں ہم

عمر بھر دل میں سجائے پھرے اوروں کی شبیہ
کبھی ایسا ہو کہ اپنی بھی زیارت کریں ہم



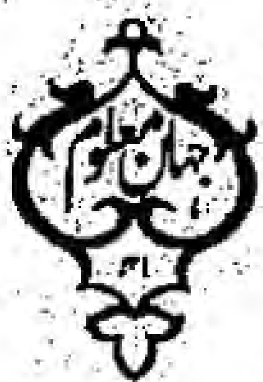


خوابِ دیرینہ سے رخصت کا سبب پوچھتے ہیں
چلیے پہلے نہیں پوچھا تھا تو اب پوچھتے ہیں

کیسے خوش طبع ہیں اس شہرِ دل آزار کے لوگ
موجِ خوں سر سے گزر جاتی ہے تب پوچھتے ہیں

اہلِ دنیا کا تو کیا ذکر کہ دیوانوں کو
صاحبانِ دلِ شوریدہ بھی کب پوچھتے ہیں

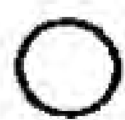
خاک اڑاتی ہوئی راتیں ہوں کہ بھیگے ہوئے دن
اوّلِ صبح کے غم آخرِ شب پوچھتے ہیں



ایک ہم ہی تو نہیں ہیں جو اُٹھاتے ہیں سوال
جتنے ہیں خاک بسر شہر کے سب پوچھتے ہیں

یہی مجبور، یہی مُہر بلب، بے آواز
پوچھنے پر کبھی آئیں تو غضب پوچھتے ہیں

کرمِ مسند و منبر کہ اب اربابِ حَکَم
ظلم کر چکتے ہیں تب مرضیِ رب پوچھتے ہیں





ہم اپنے رفتگاں کو یاد رکھنا چاہتے ہیں
دلوں کو درد سے آباد رکھنا چاہتے ہیں

مبادا مندمل زخموں کی صورت بھول ہی جائیں
ابھی کچھ دن یہ گھر برباد رکھنا چاہتے ہیں

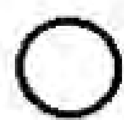
بہت رونق تھی اُن کے دم قدم سے شہرِ جاں میں
وہی رونق ہم اُن کے بعد رکھنا چاہتے ہیں

بہت مشکل زمانوں میں بھی ہم اہلِ محبت
وفا پر عشق کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں

سروں میں ایک ہی سودا کہ لو دینے لگے خاک
امیدیں حسبِ استعداد رکھنا چاہتے ہیں

کہیں ایسا نہ ہو حرفِ دعا مفہوم کھو دے
دعا کو صورتِ فریاد رکھنا چاہتے ہیں

قلم آلودۂ نان و نمک رہتا ہے پھر بھی
جہاں تک ہو سکے آزاد رکھنا چاہتے ہیں





حدودِ جاں سے پرے جا رہا ہے اور طرف
لہو بدن کو لیے جا رہا ہے اور طرف

گھٹے زمیں کی طرف شاخِ سُرخرو کی مثال
مثالِ اَبر گھٹے جا رہا ہے اور طرف

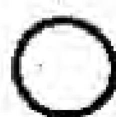
غبارِ جادۂ بے اعتبار، آخر کار
تلاش کر کے مجھے جا رہا ہے اور طرف

مری طرح ہے مرے شہر کا مقدر بھی
بکھر بکھر کے بسے جا رہا ہے اور طرف



میں ایک اور طرف جا رہا ہوں خواب کے ساتھ
زمانہ مجھ کو لیے جا رہا ہے اور طرف

محاذ رات نے کھولے ہوئے ہیں دل کے خلاف
مگر چراغ جلے جا رہا ہے اور طرف





آسمانوں پر نظر کر انجم و مہتاب دیکھ
صبح کی بنیاد رکھنی ہے تو پہلے خواب دیکھ

ہم بھی سوچیں گے دعائے بے اثر کے باب میں
اِک نظر تو بھی تضادِ منبر و محراب دیکھ

دوش پر ترکش پڑا رہنے دے پہلے دل سنبھال
دل سنبھل جائے تو سوئے سینۂ احباب دیکھ

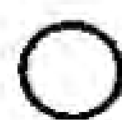
موجۂ سرکش کناروں سے چھلک جائے تو پھر
کیسی کیسی بستیاں آتی ہیں زیرِ آب دیکھ

بوند میں سارا سمندر آنکھ میں کُل کائنات
ایک مشت خاک میں سورج کی آب تاب دیکھ

کچھ قلندر مشربوں سے راہ و رسمِ عشق سیکھ
کچھ ہم آشفتہ مزاجوں کے ادب آداب دیکھ

شب کو خطِ نور میں لکھی ہوئی تعبیر پڑھ
صبح تک دیوارِ آئندہ میں کھُلتے باب دیکھ

افتخار عارف کے تند و تیز لہجے پر نہ جا
افتخار عارف کی آنکھوں میں اُلجھتے خواب دیکھ





ہم نہ ہوئے تو کوئی افق مہتاب نہیں دیکھے گا
ایسی نیند اڑے گی پھر کوئی خواب نہیں دیکھے گا

نرمی اور مٹھاس میں ڈوبا یہی مہذب لہجہ
تلخ ہُوا تو محفل کے آداب نہیں دیکھے گا

پیش لفظ سے اختتام تک پڑھنے والا قاری
جس میں ہم تحریر ہیں بس وہی باب نہیں دیکھے گا

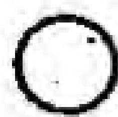
لہو رلاتے ، خاک اڑاتے موسم کی سفاکی
دیکھتے ہیں کب تک یہ شہر گلاب نہیں دیکھے گا



بپھرے ہوئے دریا کو ہوا کا ایک اشارہ کافی
کوئی گھر، کوئی بھی گھر سیلاب نہیں دیکھے گا

بے معنی بے مصرف عمر کی آخری شام کا آنسو
ایک سبب دیکھے گا سب اسباب نہیں دیکھے گا

اک ہجرت اور ایک مسلسل دربدری کا قصّہ
سب تعبیریں دیکھیں گے کوئی خواب نہیں دیکھے گا





مقدّر ہو چکا ہے بے در و دیوار رہنا
کہیں طے پا رہا ہے شہر کا مسمار رہنا

نمودِ خواب کے اور انہدامِ خواب کے بیچ
قیامت مرحلہ ہے دل کا ناہموار رہنا

دلوں کے درمیاں دوری کے دن ہیں اور ہم کو
اِسی موسم میں تنہا برسرِ پیکار رہنا

اندھیری رات اور شورِ سگانِ کوئے دشنام
اور ایسے میں کسی اک آنکھ کا بیدار رہنا

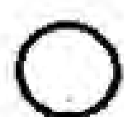


تماشا کرنے والے آرہے ہیں جوق در جوق
گروہِ پا بجولاں! رقص کو تیّار رہنا

ہوائے کوئے قاتل بے ادب ہونے لگی ہے
چراغِ جادۂ صدق و صفا ہشیار رہنا

یہ دشواری تو آسانی کا خمیازہ ہے ورنہ
بہت ہی سہل تھا ہم کو بہت دشوار رہنا

ادھر کچھ دن سے اس بستی کو راس آنے لگا ہے
ہم آشفتہ سروں کے درپئے آزار رہنا





کوئی مژدہ نہ بشارت نہ دعا چاہتی ہے
روز اک تازہ خبر خلقِ خدا چاہتی ہے

موجِ خوں سر سے گزرنی تھی سو وہ بھی گزری
اور کیا کوچۂ قاتل کی ہوا چاہتی ہے

شہرِ بے مہر میں لب بستہ غلاموں کی قطار
نئے آئینِ اسیری کی بِنا چاہتی ہے

کوئی بولے کہ نہ بولے قدم اُٹھیں نہ اُٹھیں
وہ جو اک دل میں ہے دیوار اُٹھا چاہتی ہے



ہم بھی لبیک کہیں اور فسانہ بن جائیں
کوئی آوازِ سرِ کوہ ندا چاہتی ہے

یہی لَو تھی کہ الجھتی رہی ہر رات کے ساتھ
اب کے خود اپنی ہواؤں میں بجھا چاہتی ہے

عہدِ آسودگیِ جاں میں بھی تھا جاں سے عزیز
وہ قلم بھی مرے دشمن کی انا چاہتی ہے

بہرِ پامالیِ گُل آئی ہے اور موجِ خزاں
گفتگو میں روشِ بادِ صبا چاہتی ہے

خاک کو ہمسرِ مہتاب کیا رات کی رات
خلق اب بھی وہی نقشِ کفِ پا چاہتی ہے

فضائیں وحشتِ سنگ و سناں کے ہوتے ہوئے
قلم ہے رقص میں آشوبِ جاں کے ہوتے ہوئے

ہمیں میں رہتے ہیں وہ لوگ بھی کہ جن کے سبب
زمیں بلند ہوئی آسماں کے ہوتے ہوئے

بضد ہے دل کہ نئے راستے نکالے جائیں
نشانِ رہگزرِ رفتگاں کے ہوتے ہوئے

جہانِ خیر میں اک حجرۂ قناعت و صبر
خدا کرے کہ رہے جسم و جاں کے ہوتے ہوئے



قدم قدم پہ دلِ خوش گماں نے کھائی مات
روش روش نگہِ مہرباں کے ہوتے ہوئے

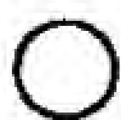
میں ایک سلسلۂ آتشیں میں بیعت تھا
سو خاک ہو گیا نام و نشاں کے ہوتے ہوئے

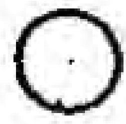
میں چپ رہا کہ وضاحت سے بات بڑھ جاتی
ہزار شیوۂ حسنِ بیاں کے ہوتے ہوئے

الجھ رہی تھی ہواؤں سے ایک کشتیِ حرف
پڑی ہے ریت پہ آبِ رواں کے ہوتے ہوئے

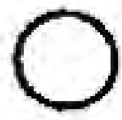
بس ایک خواب کی صورت کہیں ہے گھر میرا
مکاں کے ہوتے ہوئے لامکاں کے ہوتے ہوئے

دعا کو ہات اٹھاتے ہوئے لرزتا ہوں
کبھی دعا نہیں مانگی تھی ماں کے ہوتے ہوئے





سفرِ شوق پہ احسانِ بہار ایسا ہے
رنگ اُڑتے نظر آتے ہیں غبار ایسا ہے



ستارہ وار جلے پھر بجھا دیے گئے ہم
پھر اِس کے بعد نظر سے گرا دیے گئے ہم

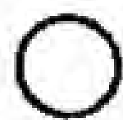
عزیز تھے ہمیں نو واردانِ کوچۂ عشق
سو پیچھے ہٹتے گئے راستہ دیے گئے ہم

شکست و فتح کے سب فیصلے ہوئے کہیں اور
مثالِ مالِ غنیمت لٹا دیے گئے ہم



زمین فرشِ گل و لالہ سے سجائی گئی
پھر اس زمیں کی امانت بنا دیے گئے ہم

دعائیں یاد کرا دی گئی تھیں بچپن میں
سو زخم کھاتے رہے اور دعا دیے گئے ہم





تارِ شبنم کی طرح، صورتِ خس ٹوٹتی ہے
آس بندھنے نہیں پاتی ہے کہ بس ٹوٹتی ہے

آرزوؤں کا ہجوم اور یہ ڈھلتی ہوئی عمر
سانس اُکھڑتی ہے نہ زنجیرِ ہوس ٹوٹتی ہے

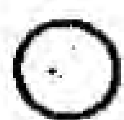
گرد اتنی کہ سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی
شور اتنا ہے کہ آوازِ جرس ٹوٹتی ہے

منہدم ہوتا چلا جاتا ہے دل سال بہ سال
ایسا لگتا ہے گرہ اب کے برس ٹوٹتی ہے



بُوئے گُل آئے نہ آئے مگر عشّاق کے بیچ
اتنی وحشت ہے کہ دیوارِ قفس ٹوٹتی ہے

ذکرِ اسمائے الٰہی کا ہے فیضان کہ اب
دَم اُلجھتا ہے نہ تسبیحِ نفس ٹوٹتی ہے



اب اس میں کاوش کوئی نہ کچھ اہتمام میرا
ہوائیں محفوظ کر رہی ہیں کلام میرا

میں کچھ کریموں کے بابِ نعمت سے منسلک ہوں
سو خود بخود ہو رہا ہے سب انتظام میرا

تو کیا یہی اک گمان ہے ہر سخن کی بُنیاد
کہ حدِّ تارِ نفس سے آگے ہو نام میرا

میں سرکشی سے سپردگی کی طرف چلا ہوں
خدا جو چاہے تو یہ بھی بن جائے کام میرا



چلا تو ہوں ایک منزلِ خوش خبر کی جانب
عجب نہیں یہ سفر بھی ہو ناتمام میرا

دلوں کو تاراج کرنے آیا تھا تمکنت سے
پلٹ گیا مجھ کو دیکھ کر خوش خرام میرا

جو لالہ و گل کو خار و خس سے جُدا نہ کر پائے
ہر ایسے موسم کو دور ہی سے سلام میرا

یہ قتل نامے پہ دستخط تو مرے نہیں ہیں
مگر یہ خلقِ خُدا جو لیتی ہے نام میرا

یہ میرے دشمن یونہی تو پسپا نہیں ہوئے ہیں
کوئی تو ہے لے رہا ہے جو انتقام میرا

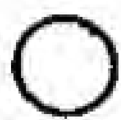
○

ستمبر! راستہ دے

ستمبر! راستہ دے
کوئی چہرہ مری نا مطمئن آنکھوں میں پھر کچھ خواب رکھنا چاہتا ہے
کوئی موسم مجھے شاداب رکھنا چاہتا ہے
بہت تپتے ہوئے صحراؤں کو سیراب رکھنا چاہتا ہے
ستمبر! راستہ دے
زمانہ جانتا ہے منہدم ہوتے ہوئے خوابوں کی دلداری میں کس حد تک گیا ہوں میں
ستمبر! بے یقیں رستوں پہ تنہا چلتے چلتے تھک گیا ہوں میں



کہیں پامال ہو جائے نہ پھر شہرِ مقدر، راستہ دے
کہیں معدوم ہو جائے نہ پھر اُمید کا کھلتا ہوا دَر، راستہ دے
دلِ بے نور کے ساحل سے ٹکراتے ہوئے اندھے سمندر، راستہ دے
ستمبر! راستہ دے
ستمبر! راستہ دے





یوں تو نہیں کہ دل میں اب کوئی نئی دعا نہیں
حرفِ دعا تو ہے مگر ذکر کا حوصلہ نہیں

دیر بہت ہی دیر تک یاد کیا گیا اُنھیں
ویسے پلٹ کے دیکھنا میرا مزاج تھا نہیں

رات بس اِک چراغ کی لَو سے رہا مکالمہ
صبح نہ جانے کب ہوئی، کیسے ہوئی پتا نہیں

ایک ذرا سی بات ہے جس سے پڑے ہیں سارے پیچ
پیچ بھی وہ کہ درمیاں کوئی بھی دوسرا نہیں



کیسی عجیب بات ہے زعمِ ہنر کے باوجود
رنگ بکھر گئے تمام نقش کوئی بنا نہیں

جس میں تمام دل کی بات کھُل کے بیان کر سکوں
ایک سخن وہی سخن مجھ سے کبھی ہوا نہیں

چہرہ بہ چہرہ، لب بہ لب، خواب بہ خواب، دل بہ دل
عمر گزار دی گئی، کوئی کہیں ملا نہیں

میری بیاضِ عشق میں مطلعِ اوّلِ غزل
درج تو کر لیا گیا ویسے کہیں پڑھا نہیں

دل کے معاملوں کے بیچ عمر کہاں سے آ گئی
جانِ جہانِ افتخار! وقت ابھی گیا نہیں

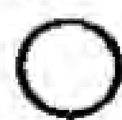
ایک کہانی بہت پرانی

عجب دن تھے

عجب نامہرباں دن تھے ، بہت نامہرباں دن تھے
زمانے مجھ سے کہتے تھے ، زمینیں مجھ سے کہتی تھیں
میں اک بے بس قبیلے کا بہت تنہا مسافر ہوں
وہ بے منزل مسافر ہوں جسے اک گھر نہیں ملتا
میں اس رستے کا راہی ہوں جسے رہبر نہیں ملتا
مگر کوئی مسلسل دل پہ اک دستک دیے جاتا تھا ، کہتا تھا مسافر!
اِس قدر نامطمئن رہنے سے کیا ہوگا
ملال ایسا بھی کیا جو ذہن کو ہر خواب سے محروم کردے
جمالِ باغِ آیندہ کے ہر امکان کو معدوم کردے
گلِ فردا کو فصلِ رنگ میں مسموم کردے



دلاسے کی اِسی آواز سے ساری تھکن کم ہو گئی تھی اور
دل کو پھر قرار آنے لگا تھا
سفر، زادِ سفر، شوقِ سفر پر اعتبار آنے لگا تھا
میں خوش قسمت تھا
کیسی ساعت خوش رنگ و خوش آثار میں مجھ کو
مرے بے بس بہت تنہا قبیلے کو نیا گھر مل گیا تھا
ایک رہبر مل گیا تھا
ایک منزل مل گئی تھی اور امکانوں بھرا خوابوں سے، اُمیدوں سے روشن
ایک منظر مل گیا تھا





خوف کے سیلِ مسلسل سے نکالے مجھے کوئی
میں پیمبر تو نہیں ہوں کہ بچالے مجھے کوئی

اپنی دنیا کے مہ و مہر سمیٹے ، سرِ شام
کر گیا جادۂ فردا کے حوالے مجھے کوئی

اتنی دیر اور توقف کہ یہ آنکھیں بُجھ جائیں
کسی بے نور خرابے میں اُجالے مجھے کوئی

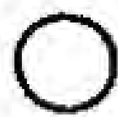
کِس کو فرصت ہے کہ تعمیر کرے از سرِ نو
خانۂ خواب کے ملبے سے نکالے مجھے کوئی

اب کہیں جا کے سمیٹی ہے امیدوں کی بساط
ورنہ اک عمر کی ضد تھی کہ سنبھالے مجھے کوئی

کیا عجب خیمۂ جاں تیری طنابیں کٹ جائیں
اِس سے پہلے کہ ہواؤں میں اچھالے مجھے کوئی

کیسی خواہش تھی کہ سوچو تو ہنسی آتی ہے
جیسے میں چاہوں اسی طرح بنا لے مجھے کوئی

تیری مرضی، مری تقدیر کہ تنہا رہ جاؤں
مگر اک آس تو دے پالنے والے مجھے کوئی





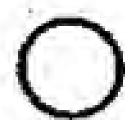
دلوں کو جوڑتی ہے، سلسلہ بناتی ہے
ہر امتحاں میں دعا راستہ بناتی ہے

یہ سیلِ سرکش و سفاک کا ہدف، مرے گھر
کوئی دن اور کہ خلقِ خدا بناتی ہے

یہ زندگی جو ابھی دھوپ ہے، ابھی سایہ
ہر آن ایک نیا دائرہ بناتی ہے

ہزار بار یہ دیکھا گیا کہ ہجر کی رات
بجھے چراغ کی لَو خود ہوا بناتی ہے

صدا، سکوت کی منزل میں بھی بشرطِ خلوص
زمانہ کیسا بھی ہو، ہم نوا بناتی ہے



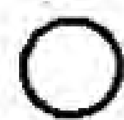


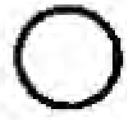
شبِ شعر میں ہُنر آشکارا مرا بھی ہو
افقِ کمال پہ اک ستارا مرا بھی ہو

یہ جو اک جزیرۂ خوش خبر پہ رُکا ہے چاند
کچھ عجب نہیں کہ وہیں کنارا مرا بھی ہو

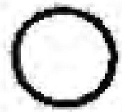
وہ جو ایک خواب کے فاصلے پہ ہے رہگزر
اُسی رہگزر پہ گزر دوبارہ مرا بھی ہو

مری مستجاب دُعاؤں میں یہ دُعا بھی تھی
وہ جو خواب دیر سے ہے تمھارا مرا بھی ہو





میں چاہتا تھا کہ سورج مری گواہی دے
سو میں نے رات کے آگے سپر نہیں ڈالی





قائدؒ کے حضور

بے اثر ہو گئے سب حرف و نوا تیرے بعد
کیا کہیں دل کا جو احوال ہُوا تیرے بعد

تو بھی دیکھے تو ذرا دیر کو پہچان نہ پائے
ایسی بدلی ترے کوچے کی فضا تیرے بعد

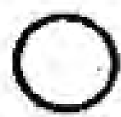
اور تو کیا کسی پیماں کی حفاظت ہوتی
ہم سے اک خواب سنبھالا نہ گیا تیرے بعد



کیا عجب دن تھے کہ مقتل کی طرح شہر بہ شہر
بین کرتی ہوئی پھرتی تھی ہوا تیرے بعد

ترے قدموں کو جو منزل کا نشاں جانتے تھے
بھول بیٹھے ترے نقشِ کفِ پا تیرے بعد

مہر و مہتاب دو نیم ایک طرف خواب دو نیم
جو نہ ہونا تھا وہ سب ہو کے رہا تیرے بعد



ہو کے دنیا میں بھی دنیا سے رہا اور طرف
دل کسی اور طرف ، دستِ دُعا اور طرف

اک رجز خوانِ ہُنر کاسہ و کشکول میں طاق
جب صف آرا ہوئے لشکر تو مِلا اور طرف

اے بہ ہر لمحہ نئے وہم میں اُلجھے ہوئے شخص
میری محفل میں اُلجھتا ہے تو جا اور طرف

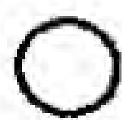
اہلِ تشہیر و تماشا کے طلسمات کی خیر
چل پڑے شہر کے سب شعلہ نوا اور طرف



کیا مسافر تھا سفر کرتا تھا اِس بستی میں
اور لَو دیتے تھے نقشِ کفِ پا اور طرف

شاخِ مژگاں سے جو ٹوٹا تھا ستارہ سرِ شام
رات آئی تو وہی پھول کھِلا اور طرف

نرغۂ ظلم میں دُکھ سہتی رہی خلقتِ شہر
اہلِ دُنیا نے کیے جشن بپا اور طرف



دوست کیا خود کو بھی پرسش کی اجازت نہیں دی
دل کو خوں ہونے دیا، آنکھ کو زحمت نہیں دی

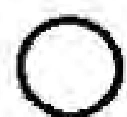
ہم بھی اُس سلسلۂ عشق میں بیعت ہیں جسے
ہجر نے دُکھ نہ دیا، وصل نے راحت نہیں دی

ہم بھی اک شام بہت اُلجھے ہوئے تھے خود میں
ایک شام اُس کو بھی حالات نے مُہلت نہیں دی

عاجزی بخشی گئی تمکنتِ فقر کے ساتھ
دینے والے نے ہمیں کون سی دولت نہیں دی

بے وفا دوست کبھی لوٹ کے آئے تو انھیں
ہم نے اظہارِ ندامت کی اذیت نہیں دی

دل کبھی خواب کے پیچھے، کبھی دُنیا کی طرف
ایک نے اجر دیا، ایک نے اُجرت نہیں دی





کوئی سبب ہے جو تاریک شب ہوئی ہے میاں
کسی کی شہ پہ ہَوا بے ادب ہوئی ہے میاں

اِس اہتمام سے اہلِ نظر کی رُسوائی
ہوئی نہ تھی کبھی پہلے جو اب ہوئی ہے میاں

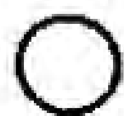
عجب نہیں در و دیوارِ شہر پر بھی ہو نقش
یہ گفتگو جو ابھی زیرِ لب ہوئی ہے میاں

بساطِ خواب اُلٹنے کی بات ، آخری بات
ہم اُٹھ کے آئے ہیں محفل سے تب ہوئی ہے میاں



نشان و خلعت و منصب کا ذکر کیا کہ یہاں
بہ کارِ عشق بھی عرضی طلب ہوئی ہے میاں

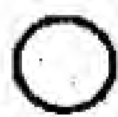
ہم اپنے دل ہی کی آزردگی نہ کم کر پائے
یہ خلق ہم سے خفا بے سبب ہوئی ہے میاں



یقین سے یادوں کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا

تم نے جو پھول مجھے رخصت ہوتے وقت دیا تھا
وُہ نظم میں نے تمھاری یادوں کے ساتھ لفافے میں بند کر کے رکھ دی تھی
آج دنوں بعد بہت اکیلے میں اسے کھول کر دیکھا ہے
پھول کی نو پنکھڑیاں ہیں
(نظم کے نو مصرعے)
یادیں بھی کیسی عجیب ہوتی ہیں
پہلی پنکھڑی یاد دلاتی ہے اس لمحے کی جب میں نے
پہلی بار تمھیں بھری محفل میں اپنی طرف مسلسل تکتے ہوئے دیکھ لیا تھا
دوسری پنکھڑی ...... جب ہم پہلی بار ایک دوسرے کو کچھ کہے بغیر
بس یوں ہی جان بوجھ کر نظر بچاتے ہوئے ایک راہداری سے گزر گئے تھے

پھر تیسری بار جب ہم اچانک ایک موڑ پر کہیں ملے
اور ہم نے بہت ساری باتیں کیں اور بہت سارے برس
ایک ساتھ، پل بھر میں گزار دیے
اور چوتھی بار .....
اب میں بھولنے لگا ہوں
بہت دنوں سے ٹھہری ہوئی اداسی کی وجہ سے شاید
کچھ لوگ کہتے ہیں اداسی تنہائی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے
ممکن ہے ٹھیک کہتے ہوں
کچھ لوگ کہتے ہیں بہت تنہا رہنا بھی اداسی کا سبب بن جاتا ہے
ممکن ہے یہ بھی ٹھیک ہو
ممکن ہے تم آؤ تو بھولی ہوئی ساری باتیں پھر سے یاد آجائیں
ممکن ہے تم آؤ تو وہ باتیں بھی میں بھول چکا ہوں جو ابھی مجھے یاد ہیں
یادوں کے بارے میں اور اداسی کے بارے میں اور تنہائی کے بارے میں
کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی





معیارِ شرف حلقۂ اربابِ ہُنر میں
ٹھہرا ہے تو بس حرف ہی ٹھہرا ہے نظر میں

مٹّی ہیں سو مٹّی ہی سے رکھتے ہیں سروکار
آتے نہیں خورشید مزاجوں کے اثر میں

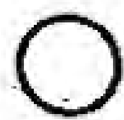
گرنے بھی نہیں پاتے دعاؤں کو اُٹھے ہاتھ
کشتی کو کنارے نظر آتے ہیں بھنور میں

ہم بھی ہیں عجب لوگ سمجھتے بھی ہیں پھر بھی
بازار کے آشوب اٹھا لاتے ہیں گھر میں



رسم و رہِ آسودگیِ جاں کی ہُوا نذر
وہ جاں سے گزُر جانے کا سودا کہ تھا سر میں

اے راہ رو کچھ تو خبر دو کہ ہُوا کیا
خوابوں کا خزانہ بھی تو تھا زادِ سفر میں



یہ کیا کہ خاک ہوئے ہم جہاں وہیں کے نہیں
جو ہم یہاں کے نہیں ہیں تو پھر کہیں کے نہیں

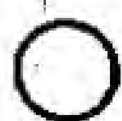
وفا سرشت میں ہوتی تو سامنے آتی
وہ کیا فلک سے نبھائیں گے جو زمیں کے نہیں

ہوا کی گرم خرامی سے پڑ رہے ہیں بھنور
یہ پیچ و تاب کسی موجِ تہ نشیں کے نہیں

سُنا گیا ہے کہ اکثر قیام و ذکر و سجود
ہیں جس کے نام اُسی جان آفریں کے نہیں

تمام عمر پھرے در بدر کہ گھر ہو جائے
گھروں میں رہنا بھی تقدیر میں انھیں کے نہیں

بکھر رہے ہیں جو آنسو بغیر منتِ دوست
وہ دامنوں کی امانت ہیں آستیں کے نہیں





کچھ بھی نہیں کہیں نہیں خواب کے اختیار میں
رات گزار دی گئی صبح کے انتظار میں

بابِ عطا کے سامنے اہلِ کمال کا ہجوم
جن کو تھا سرکشی پہ ناز وُہ بھی اُسی قطار میں

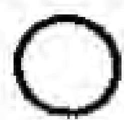
جیسے فسادِ خُون سے جلد بدن پہ داغِ برص
دِل کی سیاہیاں بھی ہیں دامنِ داغدار میں

وقت کی ٹھوکروں میں ہے عقدہ کُشائیوں کو زعم
کیسی اُلجھ رہی ہے ڈور ناخنِ ہوشیار میں



آئے گا آئے گا وہ دن ہو کے رہے گا سب حساب
وقت بھی انتظار میں خلق بھی انتظار میں

جیسی لگی تھی دل میں آگ، ویسی غزل بنی نہیں
لفظ ٹھہر نہیں سکے درد کی تیز دھار میں





نذرِ اقبالؒ

فکرِ بلند و ذوقِ تماشا کہاں سے لائیں
اقبالؒ جیسی زندہ تمنا کہاں سے لائیں

زندانیانِ شکوہ و ماتم کے روبرو
بانگِ درا کی وضع کا مژدہ کہاں سے لائیں

دنیا بدل رہی ہے زمانے کے ساتھ ساتھ
اب روز روز دیکھنے والا کہاں سے لائیں

زرخیزیِ ہنر بھی ہے مشروط نم کے ساتھ
دل سنگ ہوں تو شورشِ گریہ کہاں سے لائیں



خوابِ گزشتگانِ محبّت کے ذکر کا
لپکا ہمیں بھی ہے پہ سلیقہ کہاں سے لائیں

اسلوب میں تمازتِ خورشید کیسے آئے
لہجے میں بے کناریِ صحرا کہاں سے لائیں

مخدوم مشترک ہیں مگر بزمِ خاص میں
ویسا مقام اُن کا سا رتبہ کہاں سے لائیں

اے شہرِ بے یقین کے موسم! جواب دے
فصلِ خزاں میں لالۂ تازہ کہاں سے لائیں

کہنے کو ہیں وراثتِ اقبالؒ کے امین
ہم کم نظر وہ دیدۂ بینا کہاں سے لائیں

○

ملے گی دادِ فغاں کیا ہمیں نہیں معلوم
کہیں گے اہلِ جہاں کیا ہمیں نہیں معلوم

ہمیں تو بس یونہی جلنا ہے خاک ہونا ہے
چراغ کیا ہے دُھواں کیا ہمیں نہیں معلوم

ہمیں تو ایک ہی موسم ہے راس موسمِ درد
بہار کیا ہے خزاں کیا ہمیں نہیں معلوم

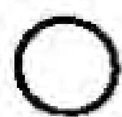
بجا کہ حاصلِ حُسنِ کلام کچھ بھی نہیں
کریں گے سنگ و سناں کیا ہمیں نہیں معلوم



پسِ غُبار ہے کیا کچھ خبر نہیں ہم کو
عیاں ہے کون نہاں کیا ہمیں نہیں معلوم

وُہ جن کی تیغ بھی دامن بھی آستیں بھی ہے سرخ
وہیں سے ملے گی اماں کیا ہمیں نہیں معلوم

یہ عہدِ سنگ سرشتاں ہے اِس زمانے میں
جوازِ شیشہ گراں کیا ہمیں نہیں معلوم





زمانہ خوش کہاں ہے سب سے بے نیاز کر کے بھی
چراغِ جاں کو نذرِ بادِ بے لحاظ کر کے بھی

غلام گردشوں میں ساری عمر کاٹ دی گئی
حصولِ جاہ کی روش پہ اعتراض کر کے بھی

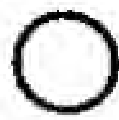
خجل ہوئی ہیں قامتیں قیامتوں کے زعم میں
مذاق بن کے رہ گئی ہیں قد دراز کر کے بھی

بس اتنا ہو کہ شغلِ ناؤ نوش مستقل رہے
قلم کو سرنگوں کیا ہے سرفراز کر کے بھی



کچھ اس طرح کے بھی چراغ شہرِ مصلحت میں تھے
بجھے پڑے ہیں خود ہوا سے ساز باز کر کے بھی

بس اک قدم کبھی پڑا تھا بے محل سو آج تک
میں دربدر ہوں اہتمامِ رخت و ساز کر کے بھی



محاذِ خیبر پر جب فتح کا منظر کُھلا تھا
نیا پرچم بعنوان مہ و اختر کُھلا تھا

صف آرائی ہوئی تھی جب میانِ ظلمت و نُور
بڑے تیور سے تیغِ تیز کا جوہر کُھلا تھا

ہوا کس کس طرح برہم ہوئی تھی بادباں پر
بھنور کس کس طرح بپھرے تھے جب لنگر کُھلا تھا

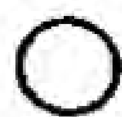
قیامت مرحلے طے کر کے پہنچے تھے یہاں تک
بہت قلعے گرے تھے تب کہیں اک در کُھلا تھا



وہ جس کے حرف میں گم گشتہ صدیاں گونجتی تھیں
اُسی کی فکر سے اسرار کا دفتر کھُلا تھا

بہت واضح بہت روشن تھے خد و خالِ فردا
کسی کی آنکھ پر جب خوابِ جاں پرور کھُلا تھا

وہی منزل اُفق آفاق تک پھیلی ہوئی تھی
وہ جس کا ایک رستہ خواب کے اندر کھُلا تھا

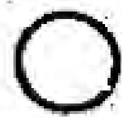


غالب کے دو مصرعے

ہمارے عندلیبِ گلشن نا آفریدہ کو
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی تھی
مگر ہم کو نہیں آتی
ہمیں آنا بھی کیا ہے
خبر کے اُس طرف کیا ہے
کبھی اُس پر نظر رکھنے کا فن ہم کو نہیں آیا
نظر کے زاویے کس طرح سے ترتیب پاتے ہیں
کہاں اور کس لیے ترتیب پاتے ہیں
کبھی اِن زاویوں کو معتبر رکھنے کا فن ہم کو نہیں آیا



ہمیں بس خوئے ماتم راس آتی ہے
کوئی موجِ ہوائے تازہ کم کم راس آتی ہے
ہمارے عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ کو
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی تھی
مگر ہم کو نہیں آتی





یہ جو گرتی ہوئی دیوار سنبھالے ہوئے ہیں
خلق کہتی ہے اُسی گھر کے نکالے ہوئے ہیں

شہرِ جاں بخش ہمیں تُو تو حقارت سے نہ دیکھ
جیسے بھی ہیں تری آغوش کے پالے ہوئے ہیں

کوچہ گردی کی ہوس ہے نہ تمنّا نہ دماغ
پھر یہ کیا ہے کہ جو اَب پاؤں میں چھالے ہوئے ہیں

بارشیں جن کی امانت ہیں وہ بادل ہوں کہ ریت
سب کسی ایک سمندر کے اُچھالے ہوئے ہیں

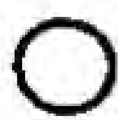
پسپا ہوتے ہوئے لشکر کے سپاہی، مرے لفظ
بجھتے بجھتے بھی زمانے کو اُجالے ہوئے ہیں



پہلے فرصت ہی کہاں تھی کہ تماشا کرتے
دل نے ضد کی ہے تو اب دیکھنے والے ہوئے ہیں

جن سے ہم دشت نوردوں کا بھرم قائم تھا
اب وہ چشمے بھی سمندر کے حوالے ہوئے ہیں

میرؔ و غالبؔ کی طرح شہر میں رُسوا ہوں گے
دونوں ہاتھوں سے جو دستار سنبھالے ہوئے ہیں



(جلیل عالی اور عرفان صدیقی کی زمین میں)



کیا خزانہ تھا کہ چھوڑ آئے ہیں اغیار کے پاس
ایک بستی میں کسی شہرِ خوش آثار کے پاس

دِن نکلتا ہے تو لگتا ہے کہ جیسے سورج
صبحِ روشن کی امانت ہو شبِ تار کے پاس

دیکھیے کُھلتے ہیں کب انفس و آفاق کے بھید
ہم بھی جاتے تو ہیں اِک صاحبِ اسرار کے پاس

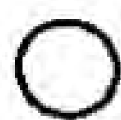
خلقتِ شہر کو مژدہ ہو کہ اِس عہد میں بھی
خواب محفوظ ہیں اِک دیدۂ بیدار کے پاس

ہم وہ مجرم ہیں کہ آسودگیِ جاں کے عوض
رہن رکھ دیتے ہیں دل درہم و دینار کے پاس

کسی گم گشتہ مسافر کی دُعاؤں کا اثر
منزلیں گرد ہوئیں جادۂ ہموار کے پاس

دل کی قیمت پہ بھی اِک عہد نبھائے گئے ہم
عمر بھر بیٹھے رہے ایک ہی دیوار کے پاس

شہِ خوبانِ جہاں ایسی بھی عجلت کیا ہے
"خود بخود پہنچے ہے گُل گوشۂ دستار کے پاس"





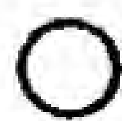
امانتِ نُور جن کے سینوں میں ہے وہ حرفِ یقیں لکھیں گے
ہماری تقدیر اور کوئی نہیں لکھے گا ہمیں لکھیں گے

لہو کے سب رنگ خواب بن کر ہماری آنکھوں میں جاگتے ہیں
سو جب بھی لکھیں گے اپنے خوابوں سے مختلف تو نہیں لکھیں گے

سُخن کے سب دلنواز لہجے کشید کرلیں گے کشتِ جاں سے
پھر اُن کو ترتیب تازہ دے کر قصیدۂ گل زمیں لکھیں گے

سلامتی ہی سلامتی کی دُعائیں خلقِ خُدا کی خاطر
ہماری مٹّی پہ حرف آیا تو عہدِ فتحِ مبیں لکھیں گے

خلیل آتش نشیں کی میراث کا تسلسل نگاہ میں ہے
سو امتحاں سے گزرنے والوں پہ حرفِ صد آفریں لکھیں گے

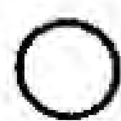


کچھ دیر پہلے نیند سے

میں جن کو چھوڑ آیا تھا شناسائی کی بستی کے وہ سارے راستے آواز دیتے ہیں
نہیں معلوم اب کس واسطے آواز دیتے ہیں
لہو میں خاک اڑتی ہے
بدن، خواہش بہ خواہش، ڈھے رہا ہے
اور نفس کی آمد و شد دل کی ناہمواریوں پر بین کرتی ہے
وہ سارے خواب ایک اک کر کے رخصت ہو چکے ہیں جن سے آنکھیں جاگتی تھیں
اور اُمّیدوں کے روزن شہرِ آئندہ میں کھلتے تھے
بہت آہستہ آہستہ
اندھیرا دل میں، آنکھوں میں، لہو میں، بہتے بہتے جم گیا ہے
وقت جیسے تھم گیا ہے



بس اب ایک اور شب ، ایک اور پل جب سارے رستے بند ہوں گے
وہ پل جب سارے بندھن ، کھڑکیاں ، آنگن ، اُمیدیں ، آرزوئیں ، رنگ سب ،
آہنگ سارے خاک کا پیوند ہوں گے
ادھر کچھ دن سے جانے کیوں اُسی پل کی اُسی ساعت کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں
بچھڑنے روٹھنے والوں کو پھر سے لوٹ آنے کی دہائی دے رہی ہیں
مگر اب کون آئے گا، پلٹ کر کون آیا ہے جنھیں آنا تھا وہ تو آئے بھی اور
کب کے رخصت ہو چکے ہیں
میں سب کچھ جانتا بھی ہوں مگر پھر بھی
مری آنکھوں میں رستہ دیکھتے رہنے کی خُو اب بھی وہی ہے
تھکن سے چُور ہوں پھر بھی سفر کی آرزو اب بھی وہی ہے

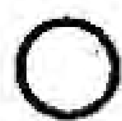


روشن دل والوں کے نام

دِل کی آنکھ سے خیر کے سارے روشن منظر دیکھنے والو!
حدِ نظر تک پھیلی ہوئی سب روشنیوں، سارے رنگوں کو
ہات سے چھو کر دیکھنے والو!
بستی بستی، گلشن گلشن، ہنستی ہوئی ساری ہریالی،
سب شادابی، دل کے اندر دیکھنے والو!
دل کے نور خزانوں کا ایک ایک چراغ جلائے رکھنا
امکانوں کے ہر کوچے میں، امیدوں کی ہر منڈیر پر
مستقبل کے ہر رستے میں، خواب کی جوت جگائے رکھنا



جگنو، سورج، چاند، ستارے
جب تک روشن ہیں یہ سارے
ہم آواز دیے جائیں گے
تم آواز ملائے رکھنا



★ ستمبر میں نابینا افراد کے عالمی دن کے موقع پر



جبینوں کو بصد تسلیم خم دیکھا گیا ہے
بہت نا مطمئن آنکھوں میں نم دیکھا گیا ہے

کہیں جائے نمازِ شکر پر آنسو کی اِک بوند
اِسی قطرے میں دجلہ یم بہ یم دیکھا گیا ہے

سب آشفتہ سروں کا ایک ہی نعرہ کہ ہم ہیں
ہم آوازوں کو دل کا ہم قدم دیکھا گیا ہے

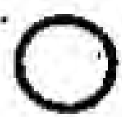
بیاضِ خواب رفتہ کیا عجب ترتیب پا جائے
کتابِ جاں کا شیرازہ بہم دیکھا گیا ہے



اُدھر اُس چاند تارے سے ذرا مشرق کی جانب
سُبک لگتا ہوا پرچمِ عَلم دیکھا گیا ہے

رفوئے زخمِ دیرینہ کی اک صورت تو نکلی
جدھر دیکھا نہیں تھا کم سے کم دیکھا گیا ہے

یہیں اک منزلِ دشوار و ناہموار کے بیچ
کہیں اک جادۂ بے پیچ و خم دیکھا گیا ہے



مقامِ شکر کہ عنوانِ گفتگو ہوئے ہم
یہی بہار کے دن تھے کہ سرخرو ہوئے ہم

ابھی کہیں بھی نہیں تھے مگر کسی کی عطا
کسی کا فیض کہ عالم میں چارسُو ہوئے ہم

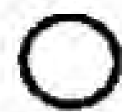
نویدِ نصرت و فتحِ مبیں جلو میں رہی
کچھ اِس یقین سے دشمن کے رُوبرو ہوئے ہم

اندھیری رات اُڑاتی رہی غبارِ سیاہ
دعائے نور کے سائے میں شعلہ رُو ہوئے ہم

مثالِ سبزۂ نورستہ سربلند رہے
نہ سرنگوں کبھی ٹھہرے نہ بے نمو ہوئے ہم

کوئی تو بات ہم آشفتگاں میں ایسی تھی
کہ خاک ہو کے بھی معیارِ آبرو ہوئے ہم

بس ایک چشمِ خوش اقبال کی توجہ سے
نظر میں آئے نگہدارِ رنگ و بو ہوئے ہم



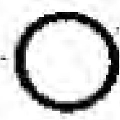
سلامی

(چند مصرعے شہید عزیز بھٹی کے لیے)

سیاہیِ شبِ ظلمت میں اک لہو کی لکیر
کھنچی اور ایسی کہ اب تک ہے روشنی ہر سمت
قلم کہ جس نے قصیدوں سے انحراف کیا
یہ چاہتا ہے کہ اس خون کو سلامی دے
(جزائے خیر و خراجِ بلند بامی دے)
جو خاکِ پاک کی نسبت سے ارجمند ہُوا
مثالِ پرچمِ سرسبز سربلند ہُوا



سوادِ نور کی سرحد پہ جاگتی ہوئی آنکھ
مرے شہید ترے جاوداں لہو کی جزا
مرے افق پہ مرے آفتاب روشن ہیں
بصد وقار و بصد آب و تاب روشن ہیں
مرا قلم، مرا دل، میرے خواب روشن ہیں



جمال احسانی کی یاد میں

ہوا بغیر دیے کا گزارا تھوڑی ہے
مگر یہ بات دیے کو گوارا تھوڑی ہے

وہ جس کسی نے بھی لکھا ہے ایک زندہ لفظ
فنا کی زد پہ بھی آیا تو ہارا تھوڑی ہے

ہم اپنی دُھن میں چلے جا رہے ہیں خواب کے ساتھ
دگرنہ ہم کو کسی نے پُکارا تھوڑی ہے

کچھ اہلِ دل سے ہے افتادگانِ خاک کا ذکر
پھر ان کے بعد یہ قصہ دوبارا تھوڑی ہے

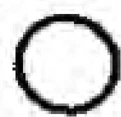


شکستِ قیمتِ دل پر ملال کیا کہ یہاں
خسارہ ہو بھی تو ایسا خسارہ تھوڑی ہے

جہاں کی ریت مسافر کو راستہ بھی نہ دے
کچھ اور ہے وہ کنارا، کنارا تھوڑی ہے

بکھرنا رات کو اور صبح کو بہم ہونا
"یہ جھگڑا صرف ہمارا تمھارا تھوڑی ہے"

جمال! اب جو بہت یاد آ رہے ہو تم
کمال اِس میں بھی پیارے ہمارا تھوڑی ہے





حجرۂ جاں میں باغ کی جانب ایک نیا در باز کیا
ہم نے میرؔ سے روتابی کی بدعت کا آغاز کیا

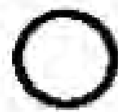
خوابوں کی پسپائی کے چرچے گلی گلی تھے جب ہم نے
دِل کے ہات پہ بیعت کر لی دنیا کو ناراض کیا

جانے وہ کیسا موسم تھا جس نے بھری بہار کے بعد
اُس گل کو شادابی بخشی ہم کو دست دراز کیا



زندہ لفظ کے مدّمقابل کیا اورنگ وطبل وعَلَم
سارے سحر بکھر جائیں گے جب ہم نے اعجاز کیا

درد کی لَے کا مدھم رکھنا عین ہنر تھا اور ہم نے
باغِ نوا کے خلوتیوں کو خلق کا ہم آواز کیا



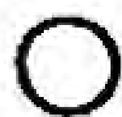
فارسی طغرا

اگر دانی کہ عالی خاندانم
نظر بر خاندانِ مصطفےٰ کُن
اگر گوئی کہ گشتم در بلائے
نظر بر کُشتگانِ کربلا کُن
بہ دنیا گر کسے پایندہ بُودے
ابوالقاسم محمد زندہ بُودے

آزاد ترجمہ

اگر کچھ زعم ہے نام و نسب پر
علوئے خاندانِ مصطفےٰؐ دیکھ

اگر رنج و مصیبت سے ہے دل چُور
تو سوئے کُشتگان کربلا دیکھ
اگر ارض و سما پایندہ ہوتے
ابوالقاسم محمدؐ زندہ ہوتے



(پندرہ برس قبل ایک سانحہ پر یہ آزاد ترجمہ کیا گیا تھا)



فغانِ کشمیر

بین سنتا ہے نہ فریاد و فغاں دیکھتا ہے
ظلم انصاف کے معیار کہاں دیکھتا ہے

جان جاتی ہے کہ رہتی ہے یہ دُنیا دیکھے
عشق کب مرحلہ سود و زیاں دیکھتا ہے

خون میں ڈوبے ہوئے سجدہ گزاروں کا دیار
کوئی دن اور کہ اک تازہ جہاں دیکھتا ہے

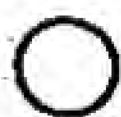
موسمِ جبر کی بنیاد میں پلتا ہوا خوف
سرفروشوں میں وہی عزمِ جواں دیکھتا ہے

لوحِ امکاں پہ جو تحریر ہے اک خواب کا نقش
ہم نہ پڑھ پائیں جہانِ گزراں دیکھتا ہے

فتح و نصرت کی خبر خلقِ خدا سنتی ہے
جشنِ فردا کا سماں وقت رواں دیکھتا ہے

شاعرِ وادیِ لولاب کا یہ حلقہ بگوش
اسی وادی کی طرف شعلہ بجاں دیکھتا ہے

ترکش و تیغ نہ پیکان و سناں دیکھتا ہے
حرفِ حق جانبِ صاحب نظراں دیکھتا ہے



شہر آشوب

اے شہرِ رسن بستہ!
کیا یہ تری منزل ہے؟
کیا یہ ترا حاصل ہے؟
یہ کون سا منظر ہے؟
کچھ بھی تو نہیں کُھلتا
کیا تیرا مقدّر ہے؟
تقدیرِ فصیلِ شہر..... کتبہ ہے کہ گلدستہ؟
اے شہرِ رسن بستہ!!



اب کوئی بھی خوابوں پر ایمان نہیں رکھتا

کس راہ پہ جانا ہے کس راہ نہیں جانا، پہچان نہیں رکھتا

شاعر ہو کہ صورت گر، باغوں کی چراغوں کی بستی کے سجانے کا سامان نہیں رکھتا

جس سمت نظر کیجیے آنکھوں میں در آتے ہیں اور خون رُلاتے ہیں

یادوں سے بھرے دامن، لاشوں سے بھرا رستہ!

اے شہرِ رسن بستہ!

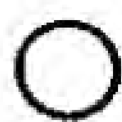
مدت ہوئی لوگوں کو چُپ مار گئی جیسے

ٹھکرائی ہوئی خلقت جینے کی کشاکش میں جی ہار گئی جیسے

ہر سانس خجل ٹھہری، بے کار گئی جیسے

اب غم کی حکایت ہو یا لطف کی باتیں ہوں کوئی بھی نہیں روتا کوئی بھی نہیں ہنستا

اے شہرِ رسن بستہ!

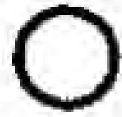




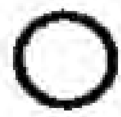
سہرا

کب سے سوچ رہا ہوں دُولہا دریا خاں ترا سہرا لکھوں
تیرا سہرا میں کیا لکھوں
ہوشو اور ہیمو نے تیرے سہرے لکھے
سرخ لہو سے
کتنے اجلے کتنے روشن سہرے لکھے
میں کیا لکھوں
پھر بھی اک وعدہ کرتا ہوں
اب کے جب بھی دھمال پڑی تو میں بھی تیرے ساتھ
رہوں گا
میں تیرا سہرا لکھوں گا
ساتھ جیوں گا
ساتھ مروں گا





بدگمانی میں کبھی گاہ خوش اندیشی میں
کٹ گئی عمر مراسم کی کمی بیشی میں
اور اک تازہ کتاب آئی نئے خواب کے ساتھ
اِک چراغ اور جلا حجرۂ درویشی میں





شورشِ خلق کو ہنگامۂ عامی نہ سمجھ
چُپ کو منجملۂ آدابِ سلامی نہ سمجھ

نعرہ زن ہے جو یہ صف بستہ غلاموں کی قطار
ان کو اپنے ستم و جور کا حامی نہ سمجھ

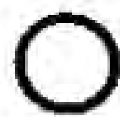
آئنہ خانۂ تشہیر کی سج دھج پہ نہ جا
سب تماشا ہے تماشے کو دوامی نہ سمجھ

حرفِ شیرین و دلآویز کو بے صرفہ نہ جان
سخنِ نرم کو تہذیب کی خامی نہ سمجھ



منقلب ہوتا ہے دلِ انفس و آفاق سمیت
بندگی کو یکے از صنفِ غلامی نہ سمجھ

تیر و شمشیر کی شہ پا کے اُچھلتے ہوئے لوگ
یہ ہیں رسوائے زمانہ اِنھیں نامی نہ سمجھ





نعت

بطرزِ مختلف اک نعت لکھنا چاہتا ہوں
میں ساری نعمتیں اک ساتھ لکھنا چاہتا ہوں

مرا معبود خود توفیق ارزانی کرے گا
میں وصفِ سترِ موجودات لکھنا چاہتا ہوں

حضورؐ اور محترم وابستگانِ شہرِ حکمت
میں اس بستی کے سب حالات لکھنا چاہتا ہوں

بہت برہم بہت ہی منتشر اوراقِ جاں پر
جہاں تک سانس ہے اثبات لکھنا چاہتا ہوں

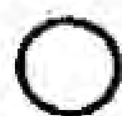


دل و دُنیا مجھے آواز دیتے ہیں بیک وقت
میں جب بھی صورتِ حالات لکھنا چاہتا ہوں

نہ تسخیر طلسم و اسم ہے موضوع میرا
نہ تفسیرِ صفات و ذات لکھنا چاہتا ہوں

نہ استدراک کی معیار بندی میرا منصب
نہ میں ترتیبِ استنباط لکھنا چاہتا ہوں

حضور سیّد و سردارؐ جو توقیر پا جائیں
وہی حرفِ شرف دن رات لکھنا چاہتا ہوں





نعت

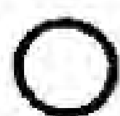
جو میں نہیں کر سکا مرے ہم قلم کریں گے
بصورتِ نعت استغاثہ رقم کریں گے

حضوری و حاضری کے آداب جانتے ہیں
درِ مطہّر پہ گفتگو کم سے کم کریں گے

میں کچھ کریموں کے بابِ نعمت سے منسلک ہوں
سو میں جہاں بھی رہوں گا مجھ پر کرم کریں گے

وہ پاک مٹّی جو اُن کے قدموں سے مس ہوئی ہے
ندامتوں کے ہزار اشکوں سے نم کریں گے

خدا جو توفیق دے تو طیبہ کی ہر گلی میں
درودِ پیہم سے جسم و جاں تازہ دم کریں گے





نعت

بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ کے آقاؐ ادھر بھی
بدل جاتی ہے جس سے دل کی دنیا وہ نظر بھی

میں بسم اللہ لکھ کے جب بھی لکھتا ہوں محمدؐ
قلم قرطاس پر آتے ہی جھک جاتا ہے سر بھی

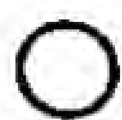
حرم سے مسجد الاقصیٰ اُدھر سدرہ سے آگے
مسافر بھی عجب تھا اور عجب تھی رہگزر بھی

محمدؐ کے خدا جب بھی کبھی مشکل کا وقت آئے
دعا کو ہات اٹھیں اور دعا میں ہو اثر بھی



بحقِ کفش برداران دربارِ رسالتؐ
ثنا خوانوں میں شامل ہو گیا اک بے ہنر بھی

میں پہلے بھی مشرف ہو چکا ہوں حاضری سے
خدا چاہے تو یہ نعمت ملے بارِ دگر بھی





نعت

دلوں کے ساتھ جبینیں جو خم نہیں کرتے
وہ پاسِ مدحتِ خیرُ الاُمَم نہیں کرتے

دُعا بغیر، اجازت بغیر، اذن بغیر
ہم ایک لفظ سپردِ قلم نہیں کرتے

کتابِ حق نے جنھیں مصطفیٰؐ قرار دیا
جز اُن کے اور کوئی ذکر ہم نہیں کرتے

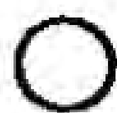
کریم ایسے کہ انعام کرتے جاتے ہیں
جواد ایسے کہ نعمت کو کم نہیں کرتے



جو اُن کے جادۂ رحمت سے منحرف ہو جائیں
زمانے ان کو کبھی محترم نہیں کرتے

میسّر آتی ہے جن کو درُود کی توفیق
کسی بھی حال میں ہوں کوئی غم نہیں کرتے

نظر میں طائف و مکّہ رہیں تو اُن کے غلام
جواب میں بھی ستم کے ستم نہیں کرتے



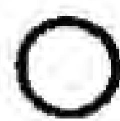
نَصرٌ مِّنَ اللہ......!

مرے آقا نے فرمایا کہ لوگو!
سوالِ نور و ظلمت ہے تو آؤ
ہم اپنے انجم و مہتاب لائیں
تم اپنے انجم و مہتاب لاؤ
پھر اس کے بعد یہ دیکھیں کہ خطِّ نور کس کے امر کی تصدیق کرتا ہے
کسے حرفِ غلط گردانتا ہے اور کسے صدّیق کرتا ہے

وہی ہے وحشتِ ظلمات و ظلمت
نشانِ آگہی بے نور اندیشوں کی زد میں ہے
شمارِ منزلِ تجدید بابِ مسترد میں ہے
بنامِ انجم و مہتاب اک غولِ بیابانی نے
ایسی خاک اڑائی ہے کہ سارا مطلعِ خیر و خبر دھندلا رہا ہے



کہاں کی حُرمت اقدار و افکار
وجودِ خیر پر حرف آ رہا ہے
غبارِ بے نہایت کا سماں ہے
" خداوندا ! تری نصرت کہاں ہے ؟ "





اے زمینِ کربلا اے آسمانِ کربلا
تجھ کو یاد آتے تو ہوں گے رفتگانِ کربلا

کر رہے ہیں ذکر اُن کے حق کو پہچانے بغیر
سلسلے باطل کے اور زعمِ بیانِ کربلا

کچھ بریدہ بازوؤں والے نے لکھی ریت پر
کچھ کہانی کہہ گیا اک بے زبانِ کربلا

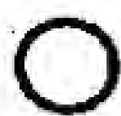
اپنے اپنے زاویے سے اپنے اپنے ڈھنگ سے
ایک عالم لکھ رہا ہے داستانِ کربلا



مصحفِ ناطق تلاوت کر رہا تھا وقتِ عصر
سُن رہے تھے خاک پر آسودگانِ کربلا

ٹھوکروں میں ہے شکوہ و شوکتِ دربارِ شام
کوئی حُرؔ کے دل سے پوچھے عزّ و شانِ کربلا

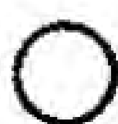
استغاثے کی صدا آئی ہے اُٹھو افتخارؔ!
استغاثہ جس میں شامل ہے اذانِ کربلا



جو دل کی امانت ہے وہ منظر مرا بچ جائے
میں جاں سے گزر جاؤں مگر گھر مرا بچ جائے

کیا دن تھے کہ ہر معرکۂ صبر کے باوصف
مانگی تھیں دعائیں کہ ستم گر مرا بچ جائے

اُس دن سے مَیں ڈرتا ہوں کہ جس دن سرِ مقتل
دستار سلامت نہ رہے سر مرا بچ جائے



غیروں سے دادِ جور و جفا لی گئی تو کیا
گھر کو جلا کے خاک اُڑا دی گئی تو کیا

غارت گریِ شہر میں شامل ہے کون کون
یہ بات اہلِ شہر پہ کھل بھی گئی تو کیا

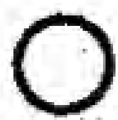
اِک خواب ہی تو تھا جو فراموش ہو گیا
اِک یاد ہی تو تھی جو بھلا دی گئی تو کیا

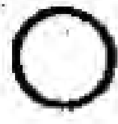
میثاقِ اعتبار میں تھی اِک وفا کی شرط
اِک شرط ہی تو تھی جو اٹھا دی گئی تو کیا

قانونِ باغبانیِ صحرا کی سرنوشت
لکھی گئی تو کیا جو نہ لکھی گئی تو کیا

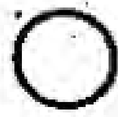
اس قحط و انہدامِ روایت کے عہد میں
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کی گئی تو کیا

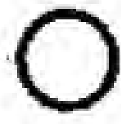
جب میر و میرزا کے سخن رائیگاں گئے
اِک بے ہُنر کی بات نہ سمجھی گئی تو کیا



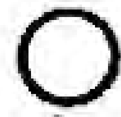


کبھی سمندر پی جاتے تھے ایک سانس میں ہم
گئی رات تو اک کوزہ بھی دریا لگا ہمیں





یہ کون چھوڑ گیا رات کے اندھیرے میں
شکست کھائے ہوئے دشمنوں کے گھیرے میں



پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

انتظاریہ

کچھ غزل اور افتخار عارف کے بارے میں

غزل ایک صنفِ سخن ہی نہیں بلکہ ہمارا پیرایۂ اظہار اور ثقافتی نسب نامہ بھی ہے۔ اس نسب نامے میں ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کے امکانات اور شرف کے نشانات موجود ہیں۔ غزل نے ہمارے اظہار کے امکانات کی خبر ہمیں دی ہے۔ کوئی بھی صنفِ سخن ہو جب ہمیں اپنے امکانات کی خبر دیتی ہے تو غزل کے لہجے میں گفتگو کرتی ہے:

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

جانے میں رسولوں کی دعا، آنے میں تاثیر
بن جانے میں تدبیر، بگڑ جانے میں تقدیر

جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے



اور جوش صاحب کی نظمیں تو غزل مسلسل ہیں۔ تو کیا میں نے غلط کہا کہ غزل ہمارا پیرایۂ اظہار اور لبِ گفتار ہے۔

برہنہ گفتاری اور برہنہ گوئی کے اس دور میں ایسے صاحبِ گفتار موجود ہیں جو اس جمال پردہ دار کے محرم اسرار ہیں جس کو غزل کہتے ہیں۔ غزل جو وقت کے غسلِ آتشیں کے ذریعہ سدا سہاگن بنی۔ اردو کے روایت شکن شاعر میراجی کے خیال کے مطابق ہماری تہذیب کی دو سدا سہاگنیں ہیں۔ ایک اردو غزل اور دوسری میری کا شہر دلّی۔ اُن منتخب برگزیدہ آوازوں میں افتخار عارف بھی شامل ہیں۔ ان کی غزل ہماری روایات کا احاطہ کرتی ہے، ان کے دور کا بھی اور ان کی ذات کا بھی۔ غزل کہنے، غزل کو سمجھنے کے لئے نہایت مہذب اور تہذیب یافتہ شخصیت کی ضرورت ہے۔ وہ شخصیت اور ذہن جو کائنات کی ہر شے میں زیریں لہر کی طرح موجود ربط اور رشتے کو سمجھ سکے، جسے یہ خبر ہو کہ:

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

غزل کی "بزمِ انجم" کا ہر ستارہ دوسرے سے الگ نظر آتا ہے لیکن ان کا رابطہ باہم فکر اور احساس کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ ہر بڑے اور قابلِ توجہ غزل گو کی ایک فکری دنیا ہوتی ہے جس کو تربیت یافتہ قاری سمجھتا ہے۔ میر کی اس کارگہ شیشہ گراں میں فرد کی فردیت اور کائنات سے اس کے تعلق کے شواہد نمایاں ہیں۔ آتش کے ہاں ایک ایسی روحانیت ہے جس میں حرکت بھی ہے اور جو زندگی کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کی قوت انسان کے مرتبے کا اعلان ہے، غالب نے تمنائے

دیدن اور تقاضائے چیدن کو بلند تر کر کے کائناتی سطح تک پہنچا دیا' یگانہ کی ہمت اور حوصلہ مندی نے نعروں کو بہت پیچھے چھوڑ کر غزل کو ایک نئے آہنگ کا امین بنایا اور اقبال کی غزل تو فراق کے الفاظ میں حیات و کائنات کا ایک ہمہ گیر اور کُل شناس آئینہ ہے۔

اِن سب اور کچھ دوسری آوازوں نے افتخار عارف کو آدابِ سخن سکھائے ہیں۔ اِس پر اضافہ کیجیے اُس فضا کا اور اُس ماحول کا جس میں افتخار عارف نے اپنے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے لکھنوی تہذیب کی شامِ غریباں بھی دیکھی ہے اور عہد نو کی صبح بھی۔

اب اِس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
مجھ پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

اپنے نئے وطن میں جو اُن کی ارضِ موعودہ تھا' افتخار عارف کا برق سامان حافظہ اور عالمی مسائل کی معلومات کا دائرہ' ان کے تعارف کا وسیلہ ہے لیکن افتخار عارف معلومات کو علم میں بدلنے کے پروسس سے ایک لمحے کے لئے غافل نہیں رہے اور یہی علم اُن کی شاعری کی اساس بنا۔ شعر صرف معاملاتِ دل کا نام نہیں بلکہ یہ عرفانِ حیات اور تفہیم کائنات کے مرحلوں تک رسائی سے عبارت ہے' اور اِس مہم میں آدمی کو اپنے آپ کو اور الفاظ کو فتح کرنے کا ہنر سیکھنا پڑتا ہے۔ افتخار عارف نے لکھنؤ کی فضاؤں میں ماضی اور اپنے دور کی شاعرانہ آوازوں کو سنا' دیکھا اور سمجھا۔ یہ آوازیں اُن کی ذات کا عنصر بن گئیں اور ایک تازہ اور توانا قوت کے درجے پر فائز ہوئیں۔ اپنی نوعمری میں افتخار عارف یہ نکتہ سیکھ گئے کہ:

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد

تو اُن کی ذات کی توسیع ہوتی رہی ہے اُن کی آواز زندگی کے معمل میں نئے سانچوں میں ڈھلتی رہی یہاں تک کہ اُن کا لہجہ مخصوص شکل اختیار کر گیا۔ افتخار عارف کی طباعی، علم سے قوت حاصل کرتی رہی۔ الفاظ شناسی اور ترکیب تراشی کے مراحل اُن پر آسان ہوتے گئے۔ افتخار کے شعورِ نغمہ کو بھی اُن کے لہجے کی ترتیب وصورت گری میں بڑا دخل رہا ہے۔ اُن کے ہاں روایتی روانی کی جگہ ایک ٹھہراؤ ہے اور اُن کے اشعار پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ایک قدرتی چشمہ اظہار کے راستے کے پتھروں سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھ گیا ہے۔ افتخار عارف کی نحوی اور لسانی ترتیب و ترکیب بھی ایک جداگانہ ذائقہ رکھتی ہے اور اُن کے لہجے کی منفرد خصوصیات کا منبع ہے۔ افتخار عارف کی منتخب بحروں میں ایک فن کارانہ ادھورا پن ہے۔ بات کہی بھی گئی اور کسی حد تک ناگفتہ بھی ہے۔ حضرت علیؑ کے الفاظ میں انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ زبان سے مُراد الفاظ اور اُن کے معانی ہیں۔

یہ ایک نام افتخار عارف کی تمام کاوشوں اور اُن کی زندگی کی ہر جہت کو سمجھنے کے لئے ایک رمز ہے اور اس کی رمز کشائی اُن کے کلام کی تفہیم کے لیے ضروری ہے۔ یہ نام، یہ اسم علیؑ ہے۔ یہ اسم ایک حرفِ باریاب بھی ہے۔ یہ اسم اُس شرر کا اشارہ ہے جو ہمارے رب نے ہماری خاک میں رکھا ہے اور جو نانِ شعیر سے ادب اور زندگی دونوں کو آبرومند بناتا ہے۔

افتخار عارف کی شاعری کا بنیادی موضوع رزقِ جلیل ہے۔ یہی رزقِ جلیل قربتِ خسروانہ میں بھی ہمیں مرنے نہیں دیتا بلکہ حیاتِ ابدی کا سراغ دیتا ہے۔ یہی رزقِ جلیل اور نانِ جویں ہمیں اُس مستقر تک پہنچاتی ہے جسے گھر کے علاوہ کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ افتخار عارف کی شاعری کا موضوع رزقِ حلال اور وہ گوشۂ عافیت ہے جو مکان کو گھر بناتا ہے اور اِن دونوں کا حصول ہمیشہ اُس منزل تک پہنچاتا ہے کہ موت ہمارے جسم کو چھوتی ہے مگر ہمارے وجود کے مرکز سے دور رہتی ہے۔

غزل کے رموز و علائم شاعری کو "بیان" بننے نہیں دیتے اور شعرا اپنے مرتبۂ عالی سے نیچے نہیں اُترتا۔ افتخار عارف کی علامتوں میں اُن کے موضوعات کو سمیٹنے کی قوت موجود ہے۔ علیؑ کی علامت کے مرکزیہ کے گرد اور کئی دائرے موجود ہیں۔ حسینؑ، کربلا، فرات، صبر، استقامت۔ کربلا ایک گزرا ہوا واقعہ نہیں بلکہ زندگی کا ایک مرحلۂ مستقل ہے۔ کربلا اُس قطرۂ خون کا نام ہے جو ہمیں مقتل تک لے جاتا ہے اور بار ہا سید سلیمان ندوی یاد آ گئے:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

غزل گو شاعر کا کمال اور فن یہی ہے کہ وہ اپنے بنیادی خیالات اور فکر کو جذبہ بنا دیتا ہے۔ جذبے کا یہی رنگ و آہنگ شعر کو فلسفے سے الگ اور ممتاز کرتا ہے کہ مجرد خیالات انسانی زندگی کی ہمہ گیری، گرمی اور گیرائی سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اِسی ہمہ گیری نے افتخار عارف کے اِس شعر کو ضرب المثل

کے درجہ پر فائز کر دیا ہے۔

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کو گھر کر دے

کسی معاشرے کے عام عقائد اور تصورات کو شعر کے وسیلے سے ضرب المثل بنا دینا ایک آسان بات ہے۔ ذوق نے اسی بات کو درجہ کمال تک پہنچا دیا مگر افتخار عارف نے اپنے فکر کو یہ عمومیت عطا کر کے سخن وری کا حق ادا کیا ہے۔

افتخار عارف نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندازِ زیست کو اپنی غزل میں انسانی صورتِ حال بنا دیا ہے۔ ہم نے ادیبوں اور مشائخ کے اجتماعات میں بیشتر ہاتھوں کو کاسۂ طلب میں بدلتے دیکھا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو کہاں کی غیرت اور کہاں کی عزتِ نفس:

ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم
کہ سارا شہر لیے کاسۂ طلب نکلا

اور انہی مناظرِ امروز میں کربلا کا استعارہ صداقتِ امروز بن کر ابھرتا ہے۔

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

اِن چند اشارات میں غزل کے آئینے میں افتخار عارف کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کاش حالات اور صحت اس کی اجازت دے کہ یہ اشارے غزل کی علامتوں کی حد سے بڑھ کر تنقید کی وضاحت بن سکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

انتظاریہ۔۲

افتخارِ عارف کی نعت

افتخار عارف نے اپنے حافظے اور علم و معلومات کے ذریعے اپنا تعارف کرایا اور پھر غزل کے اس دور میں اس کی غزل گوئی نے سماعتوں میں اپنی جگہ بنائی۔ اس کے اس شعر کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہوا:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

اس کی یہ دعا بارگاہِ ایزدی میں جس طرح قبول ہوئی اس کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں ہوگا۔ وہ کسی مکان، کسی نگر اور کسی دیار میں رہے، اللہ پاک نے مدینہ منورہ کو اس کی حقیقی شخصیت کا گھر بنا دیا ہے اور جب اس کے رب نے اسے یہ دولت عطا کر دی تو اسے خبر ہوئی اور بے اختیار دل سے آواز ابھری:

عمر بھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھروں شہر بہ شہر
ایک ہی شہر میں اور ایک ہی در پر رکھا



اور اس شہر میں اسے مدحتِ شافعِ محشر ﷺ پر مقرر کیا گیا۔ آدمی کو چاکری ملے تو ایسی کہ شہنشاہ بھی رشک کریں۔

شعر کے بارے میں کئی نظریات، تصورات اور خیالات ہیں۔ مجھے ان میں تضاد نظر نہیں آتا بلکہ یہ ایک دوسرے کا تکملہ معلوم ہوتے ہیں۔ شاعری کی ایک ادا بے ساختہ پن ہے اور ایک شیوہ آراستگی ہے۔ شاعری سادگی بھی ہے اور مرصع ساز کا کام بھی۔ افتخار عارف کی شاعری اور بالخصوص نعت میں سارے رنگ موجود ہیں۔ بحریں ایسی کہ ان میں نغمگی لفظ بہ لفظ آگے بڑھتی ہے اور مصرع ختم کرنے کے بعد اس کی لہریں ذہن میں پھیلتی جاتی ہیں۔ لفظ ایسے جیسے عقیدت اور محبت مقامِ محمدی ﷺ کے باب میں سوچ رہے ہوں۔ فکر اور جذبہ کا ایسا امتزاج آج کے کم ہی نعت گو شاعروں کے ہاں نظر آئے گا۔ افتخار عارف کی ان نعتوں میں سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ کی از ازل تا ابد وقت پر حاوی شخصیت اور رسالت کے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اہلِ بیت اور محبانِ اہلِ بیت کی محبت کی شادابی بھی ہے۔

بعض لوگ جو کٹر مذہبی دکھائی دیتے ہیں، اندر سے دنیادار نکلتے ہیں اور بعض نظر بظاہر دنیا میں ڈوبے ہوئے لوگ حقیقی مذہبیت سے مالا مال ہوتے ہیں کہ ایسی مذہبیت حبِ رسول ﷺ سے عبارت ہوتی ہے۔

افتخار عارف کی نعتوں کے مطالعے سے میری بات آپ پر واضح ہو سکے گی۔

افتخار عارف نے اپنے شعری ہنر کو جذبہ و وہم لی اس اکائی کے طور پر برتا ہے جو انفس و آفاق کی حقیقتوں اور گہرائیوں کے ادراک سے مرتب ہوتی ہے اور فکر و نظر کے وسیع تر دائرے قائم کرتی ہے۔ ان کے لہجے کا اعتماد اور آواز کا استحکام بھی ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ وہ ان جدید شاعروں میں سے ہیں جن سے شاعری کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ افتخار عارف کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ ایک ایسا اسلوب بنانے اور لحن پانے میں کامیاب رہے ہیں جس میں شاعر کا احساس ذات اس کے گرد و پیش کی فضا سے بے نیاز نہیں بلکہ اسی سے توانائی حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات اور ان کا عہد ایک دوسرے کی پہچان بن گئے ہیں۔ شاعری میں یہ منصب کبھی کبھی اور کسی کسی ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

مشفق خواجہ

یہ سالہا سال پہلے کی بات ہے کہ میرے گرد و پیش ایک پُر خیال وقوعہ ظہور میں آیا۔ وہ میری بچھڑی ہوئی تہذیب کا وقوعہ تھا، میری بچھڑی ہوئی تہذیب کا خُرسند ترین وقوعہ۔ اس کا نام تھا افتخار عارف۔ افتخار عارف ایک شگفتہ آور شخص ہے۔ اس نے زندگی کو سمجھا اور جو زندگی کو نہیں سمجھتا وہ مارا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ اس ...... زندگی کو خودکشی نہیں بنانا چاہتا۔ وہ برصغیر کی سب سے خیال انگیز، خیال آمیز اور ماجرا خیز شائستگی کا مظہر ہے.......... میں تو کوئی بڑا شاعر نہیں ہوں۔ میرا بنیادی تعلق تو فلسفے سے ہے لیکن اگر مجھے اپنی پیڑھی کا کوئی قابل ذکر شاعر سمجھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ میری پیڑھی کے بعد کا سب سے نامدار شاعر افتخار عارف ہے۔ مجھ عاجز کا حاصلِ کلام یہ ہے کہ افتخار عارف اس دور کا نادر ترین شاعر ہے۔ اب رہے اور شاعر تو وہ تاریخ فن کا وقت ضائع کرتے ہیں اور کرتے رہے ہیں۔



The theme of suffering, suffering for a noble cause, suffering in the hope that a positive meaning will emerge, has been repeated throughout Islamic poetry for centuries — just as Husayn and his family suffered on the waterless battlefield. This theme runs through a large part of recent Urdu poetry, particularly that of Iftikhar Arif. He is modern in his use of language, but classical in the way he hides his burning concerns in allusions, symbols and metaphors — an art perfected by classical Persian and Urdu poets. It allows the poet to voice his deepest concerns, hopes and fears in a form that is not time-bound but valid for every time and expresses (as Ghalib once said) what is in everyone's soul.

Annemarie Schimmel

Though deeply rooted in the classical tradition of ghazal and the later nazm poetry, Iftikhar Arif's intellectual verse is too much of a child of our planet to belong to Urdu speaking readers only. The better the outer world comes to know his poetry, the more it will understand its miracle.

To me, Iftikhar Arif is not a rebellious poet. Being a philosopher and a sharp observer, he is preaching a stoic dignity of endurance as a protest. Sometimes this way is longer and harder than revolt.

Anna Suvorova